لکھنؤ

تعمیرِ حیات

پندرہ روزہ

خواتین کا نذرانۂ عقیدت

بارگاہِ رسالت ﷺ میں

"ہم آپ پر درود وسلام بھیجتے ہیں یارسول اللہ! ایسے طبقہ کا درود وسلام جس پر آپ کا بڑا احسان ہے،

آپ نے ہم کو خدا کی مدد سے جاہلیت کی بیڑیوں اور بندشوں، جاہلی عادات وروایات، سوسائٹی کے ظلم اور مردوں کی زور دستی اور زیادتی سے نجات بخشی، لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کے رواج کو ختم کیا، ماؤں کی نافرمانی پر وعید سنائی۔

آپ نے فرمایا کہ جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے،

آپ نے وراثت میں ہم کو شریک کیا، اور اس میں ماں، بہن، بیٹی اور بیوی کی حیثیت سے ہم کو حصّہ دلایا، یوم عرفہ کے مشہور تاریخی خطبہ میں بھی آپ نے ہمیں فراموش نہیں کیا، اور کہا کہ :۔

"عورتوں کے بارے میں خدا سے ڈرو اس لئے کہ تم نے ان کو اللہ کے نام کے واسطہ سے حاصل کیا ہے"

اسکے علاوہ مختلف مواقع پر آپ نے مردوں کو عورتوں کے ساتھ حسن سلوک، ادائے حقوق اور بہتر معاشرت کی ترغیب دی، اللہ تعالےٰ آپ کو ہمارے طبقہ کی طرف سے وہ بہتر سے بہتر جزائے جو انبیاء ومرسلین اور اللہ کے نیک اور صالح بندوں کو دی جاسکتی ہے"

(کتاب "کاروانِ مدینہ")

از

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

Regd. No. L W/NP 56 FORTNIGHTLY Phone : 22948

TAMEER-E-HAYAT

Darululoom Nadwatululama, Lucknow (India)

"لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل"

(عصمت اللہ شبلی ندوی)

لندن سے نکلنے والے ایک عربی پرچہ میں ایک مغرب زدہ مسلم ہندوستانی ڈاکٹر کا تذکرہ آیا ہے جو مغرب زدگی اور مرعوبیت کا ایک نمونہ ہے یہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ پرچہ کا مضمون نگار اس واقعہ کو یوں لکھتا ہے :۔

"میرے ایک ہندوستانی دوست ڈاکٹر ہیں، ان کا نام سراج الدین ہے، وہ ناک، کان اور گلے کے آپریشن کی پریکٹس یہاں برطانیہ میں کر رہے تھے، اسی میں جب وہ ماہر ہوئے اور ان کو اسپیشلائزکی ڈگری ملی تو انہوں نے ایک زبردست پارٹی کا اہتمام کیا، اس پارٹی میں مجھے بھی دعوت دی، کیف ومستی میں ڈوبی ہوئی وہ ایک پُرسکون شام تھی، اس پارٹی میں ہمارے ڈپارٹمنٹ کے تقریبًا سبھی شریک تھے، حاضرین کی خاطر مختلف قسم کے نہایت لذیذ اور بہترین مشروبات اور مختلف قسم کے ہندوستانی کھانوں سے ہوئی۔ ہمارے وہ ہندوستانی دوست خوشی ومسرت میں جھوم رہے تھے، ان کے رگ رگ سے فرحت وانبساط ٹپک رہی تھی وہ کیف ومستی میں دیوانہ وار ادھر سے اُدھر ٹہل رہے تھے، کبھی اس سے مذاق کرتے تو کبھی اس سے تفریح لیتے —— پھر اس کے بعد ایک جگہ ہم گفتگو کرنے کے لئے بیٹھ گئے۔ باتوں باتوں میں انہوں نے ایک چھوٹا سا کتابچہ نکالا جس میں برطانوی تاج کا مارکہ تھا، اسے دیکھ کر مجھے ایک قسم کی دہشت سی ہوئی اور اس نے فورًا یہ سمجھ لیا کہ یہ برطانوی پاسپورٹ ہے وہ مجھے دکھا کر انتہائی خوشی ومسرت میں کہنے لگے، میں نے تو اس کو حاصل کر لیا۔ میں نے کہا تم نے کیا حاصل کر لیا، تمہیں کیا ملا؟ کہنے لگے کہ یہ برطانوی شہریت ہے —— میں قدرے غصہ میں بولا، تو اس برطانوی شہریت سے تمہیں کیا عزت وشرف حاصل ہوگا؟ کہنے لگے، مسئلہ شرف وعزت میں قلت وکثرت کا نہیں۔ برطانوی شہریت حاصل کرنا ہی میرے لئے اس ملک میں عیش وتنعم کے دروازے کھل جانا ہے، میں نے پوچھا کیا تم یہاں رہنے کا ارادہ کر رہے ہو؟ کہنے لگے کیوں نہیں۔ شہر کے ایک بہترین جگہ میں نے ایک خوبصورت گھر خرید لیا ہے، اور میری جرمنی کار بالکل نئی بنی ہوئی ہے۔ اور تمہیں تو اس بات سے واقفیت ہے ہی کہ میری بیوی انگریز ہے تو میں نے سوچا کہ کیوں میں اس ملک کو اپنا وطن نہ بنالوں جبکہ تمام آسائش اور راحت وآرام مجھے حاصل ہے —— میں نے کہا، تو تمہارا ارادہ ہندوستان جانے کا بالکل نہیں؟ کہنے لگے، بھئی میں وہاں جاکر کیا کروں۔ لوگ وہاں بھوکوں مر رہے ہیں اور سرکاری نوکری بالکل بیکار ہے اس سے خرچ پورا نہیں ہوتا۔ رہا پرائیوٹ پریکٹس تو وہاں بہت سارے ڈاکٹر وحکیم ہیں اور بیمارے وہاں کے مریض بہت غریب ہوتے ہیں وہ ڈاکٹر کو قاعدے سے فیس بھی ادا نہیں کرسکتے —— میں نے کہا، میرے دوست کیا تم یہ سوچتے ہو کہ تم کوئی اچھا کام کر رہے ہو؟ تم اس ملک میں پیدا ہوئے وہاں تمہاری نشوونما ہوئی یہاں تک کہ جوان ہوئے۔ اور پھر تمہیں وہاں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا جو تم جیسوں کتنوں کو نہ ملا ہوگا۔ اب جبکہ تمہارے بازو مضبوط ہوگئے اور تمہارے ملک کی تم سے توقعات وابستہ ہوئیں تو تم نے برطانوی شہریت حاصل کر لی۔ کیا تمہارے دل کے کسی گوشہ میں یہ خیال پیدا نہیں ہوتا کہ تمہارے ہندوستانی بھائی تمہاری خدمات اور تمہاری تعلیم کے زیادہ مستحق ومحتاج ہیں، یہاں انگریزی مریضوں کے علاج کرنے والے بہت سارے ہیں۔ میری گفتگو سنکر ان کا رنگ کچھ بدل گیا اور کہنے لگے تم مجھ سے جذباتی گفتگو نہ کرو، مجھ پر اس کا اثر نہ ہوگا، ہر شخص کی ایک رائے ہوتی ہے اور وہ اپنے مستقبل کے لئے مصالح کو پیش نظر رکھ کر قدم اٹھانے میں بالکل آزاد ہے۔ میں نے کہا، تمہیں اس بات کا احساس نہیں ہے کہ تم ایک مسلمان ہو اللہ ورسول کے سامنے مسلمان بھائیوں کے سلسلے میں تمہیں جواب دینا پڑے گا۔ تمہیں بخوبی اس کا علم ہے کہ ہندوستانی مسلمان مفلس ہیں، ان میں تعلیمیافتہ لوگوں کی بہت کمی ہے، تم ہندوستان جیسے ایک غریب ملک سے یہ امید وابستہ رکھتے ہو کہ بس وہاں بھی اتنی ہی فیس لے جتنی کہ برطانیہ اور امریکہ میں تم کو مل رہی ہے، نہیں اس سلسلے میں کچھ ایثار وقربانی سے بھی کام لینا پڑے گا۔ میری بات سنکر وہ کہنے لگے۔ شاید مستقبل بعید میں میں اپنے وطن لوٹ جاؤں، اس لئے کہ مجھے یہ پسند نہیں کہ اپنے وطن کے خاک کے علاوہ کہیں اور دفن ہو جاؤں ——"

مضمون نگار اس مغرب زدہ مسلمان ڈاکٹر کا تذکرہ کرنے کے مابعد ایک اور شخص کا تذکرہ کرتا، جو اس پارٹی میں شریک تھا، لکھتا ہے :۔

"اس پرکیف پارٹی میں ایک انگریز ڈاکٹر بھی مدعو تھے ان کے انداز اور گفتگو سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ سراج الدین کے گہرے دوستوں میں ہیں، ان سے تعارف ہوا، اور پھر ہم ایک دوسرے سے باہمی گفتگو میں مصروف ہوگئے۔ مجھے معلوم ہوا کہ ان کی پیدائش تو چین میں ہوئی ہے اور وہ مذہبی اعتبار سے پروٹسٹنٹ عیسائی ہیں۔ اور چین میں کمیونسٹ انقلاب آنے سے پہلے وہاں "کتاب مقدس" کی طباعت کا ایک مطبع میں اہتمام کرتے تھے، لیکن کمیونسٹ انقلاب آنے کے بعد ان کو وہاں سے کوچ کرنا پڑا۔

دوران گفتگو میں نے ان سے سوال کیا کیا آپ کو چین میں بچپن کا زمانہ بھی کچھ یاد ہے؟ وہ یک لمحہ خاموش ہونے کے بعد کہنے لگے۔ جب میں دس سال کا تھا تو ہم وہاں سے چلے تھے میرے گوشۂ ذہن میں سوائے کچھ دھندلے نقوش کے اور کچھ بھی نہیں لیکن اب میں اس گرمی میں ایشیا جا رہا ہوں۔ میں نے قدرے تعجب سے پوچھا۔ کیا آپ کا یہ سفر سیر وسیاحت کے لئے ہوگا۔ کہنے لگے۔ نہیں، نہیں۔ مجھے ایک عیسائی ہسپتال میں کام کرنے کا موقع مل گیا۔ جو ابھی کچھ دنوں پہلے ہی ہندوستان کے صوبہ "بہار" میں تعمیر ہوا، اور میں وہاں چند سال کام بھی کرچکا ہوں۔ اور میرا یہ خیال ہے کہ میرے لئے وہاں ایک پیغام ہے، اور مصائب وآلام میں پریشان انسانوں کے تکلیفوں اور مصیبتوں کو کم کرنے اور انہیں راحت پہونچانے کا موقع ہے۔ یہ کہکر اس نے البم کھولا اور اس عیسائی ہسپتال کی نشاندہی کی جس میں وہ کام کرتا ہے ایک تصویر دکھائی جس میں وہ خود اور بعض ہندوستانی مریض جن کے لباس گندے تھے بیٹھے ہوئے تھے، اس البم میں سے ایک اور تصویر انہوں نے دکھائی جس میں وہ اور ان کی بیوی تھی، وہ سر پر عقال باندھے ہوئے تھے اور ان کے ایک طرف بیوی ایک گدھے پر سوار تھی —— یہ چیزیں دکھا کر کہنے لگے، ہم وہاں مسیح علیہ السلام کی زندگی کا نمونہ ہسپتال کے ڈراموں میں پیش کرتے ہیں۔ میں وہاں یوسف النجار کی ایکٹنگ کرتا ہوں اور میری بیوی مریم کا پارٹ ادا کرتی ہے، اسی طرح ہم وہاں دن میں لوگوں کے علاج ومعالجہ کا کام انجام دیتے ہیں اور رات کو ان کے سامنے مسیحی پیغام پہونچاتے ہیں۔

اب دیکھئے، اس مغرب زدہ مسلم ڈاکٹر۔ اور اس عیسائی ڈاکٹر میں کسقدر تفاوت ہے، ان دونوں کے طرز کلام میں کس قدر فرق ہے، دونوں کے ایمان وعمل میں کتنا بُعد ہے —— اس سے بڑھ کر اور کیا مصیبت ہوگی، اس سے بڑھ کر رونے کا مقام اور نہیں ہوسکتا ہے۔ آج ہر جگہ مسلمانوں کی یہی حالت ہے۔ وہ اپنی تمام محنت وکوشش اور جد وجہد ان علوم وفنون کے حاصل کرنے میں صرف کرتے ہیں، خطرات اور مصیبتوں کا مقابلہ کرتے ہیں اور زندگی کا اکثر حصہ ان کے حصول میں نکل جاتا ہے۔ اور جب پھل پک کر تیار ہو جاتا ہے اور اس کے توڑنے کا وقت آتا ہے —— تو کوئی دوسرا اس کو توڑ لیتا ہے۔ مسلمانوں کا ملک اور مسلمان دن بدن تنزل پذیر ہے —— اور اغیار دن بدن ترقی پذیر۔ وہ مسلمانوں کے ان جد وجہد اور خون پسینے سے کمائی ہوئی دولت پر قابض ہو جاتے ہیں اور اس طریقے سے اپنی پوزیشن کو ترقی دیتے رہتے ہیں۔ پھر وہ انہی لوگوں کے پاس اور انہی کے شہریوں کو بھیجتے ہیں جو ظاہر میں انسانیت کے ہمدرد ہوتے ہیں لیکن ان کا باطن تعصب سے بھرا ہوتا ہے۔ یہ لوگ ان ملکوں میں پہونچ جاتے ہیں اور دو طرح کا کام انجام دیتے ہیں۔ مسلمانوں کے ایمان وعقیدہ کو متزلزل کر دیتے ہیں۔

رانا ٹرانسپورٹ کمپنی

۲۱۔ زکریا اسٹریٹ کلکتہ ۱

اترپردیش، مدھیہ پردیش، دہلی، بمبئی

فون نمبر :۔ [illegible]

برانچ :۔ بنارس، الٰہ آباد، لکھنؤ، کانپور، [illegible]

القرآن

★ ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ لوگ تم پر بناتے ہیں ان سے تمہارے دل کو سخت کوفت ہوئی ہے اس کا علاج یہ ہے کہ "اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو، اس کی جناب میں سجدہ بجالاؤ اور اس آخر گھڑی تک اپنے رب کی بندگی کرتے رہو جس کا آنا یقینی ہے۔"
(الحجر ۹۷ تا ۹۹)

★ پس اے محمدؐ، تم اور تمہارے وہ ساتھی جو (کفر و بغاوت سے ایمان و طاعت کی طرف) پلٹ آئے ہیں، ٹھیک ٹھیک راہِ راست پر ثابت قدم رہو جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے اور بندگی کی حد سے تجاوز نہ کرو جو کچھ تم کر رہے ہو، اس پر تمہارا رب نگاہ رکھتا ہے۔ ان ظالموں کی طرف ذرا نہ جھکنا ورنہ جہنم کی لپیٹ میں آجاؤ گے اور تمہیں کوئی ایسا ولی و سرپرست نہ ملے گا جو خدا سے تمہیں بچا سکے اور کہیں سے تمہیں مدد نہ پہنچے گی۔
(ہود: ۱۱۱ تا ۱۱۳)

★ ہم نے زمین اور آسمان کو اور ان کی سب موجودات کو حق کے سوا کسی اور بنیاد پر پیدا نہیں کیا ہے اور فیصلے کی گھڑی یقیناً آنے والی ہے۔
پس اے محمدؐ تم (ان بے ہودگیوں پر) شریفانہ درگذر سے کام لو۔ یقیناً تمہارا رب سب کا خالق ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔
(الحجر: ۸۵ تا ۸۶)

★ اور اے نبیؐ، تم اس ہدایت کی پیروی کئے جاؤ جو تمہاری طرف بذریعہ وحی بھیجی جا رہی ہے، اور صبر کرو یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کردے اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔
(یونس: ۱۰۹)

★ اے محمدؐ! ان لوگوں نے اس کوشش میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی کہ تمہیں فتنے میں ڈال کر اس وحی سے پھیر دیں جو ہم نے تمہاری طرف بھیجی ہے تاکہ تم ہمارے نام پر اپنی طرف سے کوئی بات گھڑو۔ اگر تم ایسا کرتے تو وہ ضرور تمہیں اپنا دوست بنا لیتے اور بعید نہ تھا کہ اگر ہم تمہیں مضبوط نہ رکھتے تو تم ان کی طرف کچھ نہ کچھ جھک جاتے، لیکن اگر تم ایسا کرتے تو ہم دنیا میں بھی دوہرے عذاب کا مزہ چکھاتے اور آخرت میں بھی دوہرے عذاب کا، پھر ہمارے مقابلے میں تم کوئی مددگار نہ پاتے۔
(بنی اسرائیل: ۷۳ تا ۷۵)

الحدیث

★ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ:۔
"دعوتی کام کرنے والوں کو صابر اور بُردبار ہونا چاہئے۔ لوگ اگر غصہ دلانے والی حرکات پر اُتر آئیں تو ایسے موقع پر غصہ کا جواب غصے سے نہیں دینا چاہئے۔ غصہ آئے تو تھوک دینا چاہئے۔ اگر لوگ ایسا کریں تو اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت فرمائے گا اور دشمن ان کے سامنے جھک جائے گا، وہ گہرا دوست اور پرجوش حامی بن جائے گا۔"
(بخاری)

★ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ قیس کے پاس دین اور اس کے احکام سکھانے کے لئے بھیجا، وہاں پہنچکر مجھے تجربے سے معلوم ہوا گویا یہ بدکے ہوئے اونٹ ہیں۔ دُنیا کے حریص، ان کا کوئی نصب العین نہیں ہے، ان کی ساری دلچسپی اپنی بکریوں اور اونٹوں سے ہے تو میں نبی صلی اللہ کے پاس واپس پہنچا، آپ نے پوچھا "اے عمارؓ! اپنے کام کی رپورٹ دو کیا کیا؟
تو میں نے آپؐ کو سارا قصہ سنایا۔ میں نے آپ کو بتایا کہ یہ لوگ دین سے غافل ہیں۔
آپ نے فرمایا، "اے عمارؓ! ان سے زیادہ تعجب خیز معاملہ ان لوگوں کا ہے جنھوں نے دین کا علم سیکھا مگر انہی کی طرح دین سے غافل اور بے پرواہ ہوگئے"۔

★ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، "تم میں سے جس شخص نے اپنے معاشرے میں کوئی برائی دیکھی اور طاقت استعمال کرکے اسے دور کر دیا تو وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہوا اور جس شخص نے طاقت نہ رکھنے کی وجہ سے اپنی زبان استعمال کی اور اس کے خلاف آواز اٹھائی وہ بھی سبکدوش ہوا اور جو شخص اپنی زبان نہ استعمال کر سکے اور دل میں اس برائی سے نفرت کرے اور بُرا سمجھے تو وہ بھی مواخذہ سے بچ جائے گا اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔"
(ترغیب وترہیب بحوالہ نسائی)

نبیِ اُمّی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ انسانی فلاح و بقا

انتخاب: مولانا افتخار فریدی مرادآباد

ایک سائل دنیا و آخرت کی فلاح و بقا و کامیابی کی راہ پانے کے چند سوال کرتا ہے۔

سائل: اے اللہ کے رسولؐ! میں چاہتا ہوں کہ دنیا کا سب سے بڑا عالم بن جاؤں۔
حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تو خدا سے ڈرتا رہ تو سب سے بڑا عالم بن جائے گا۔
سائل: میں چاہتا ہوں کہ تمام انسانوں سے زیادہ مالدار بن جاؤں۔
حضورؐ نے فرمایا:۔ تو قناعت اختیار کر سب سے زیادہ مالدار ہو جائے گا۔
سائل: میں چاہتا ہوں کہ سب سے بہتر شخص ہو جاؤں۔
حضورؐ نے فرمایا: سب سے بہتر وہ ہے جو لوگوں کو نفع پہونچائے، سب کے لئے نفع بخش بن جا بہتر ہو جائے گا۔
سائل: سب سے زیادہ عادل بننا چاہتا ہوں۔
حضورؐ نے فرمایا: تمام انسانوں کے لئے وہی پسند کر جو اپنے لئے پسند کرتا ہے سب سے زیادہ منصف عادل بن جائے گا۔
سائل: سب لوگوں سے زیادہ خدا کے دربار میں مخصوص و مقرب بننا چاہتا ہوں۔
حضورؐ نے فرمایا: خدا کا ذکر خوب زیادہ کر خدا کے دربار میں مخصوص مقرب ہو جائے گا۔
سائل:۔ میں محسنوں اور نیکوکاروں میں سے ہونا چاہتا ہوں۔
حضورؐ نے فرمایا:۔ اللہ کی عبادت ایسی کر کہ تو دیکھ رہا ہے اگر یہ نہ ہو سکے تو جیسے وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔
سائل:۔ میں چاہتا ہوں میرا ایمان مکمل ہو جائے۔
حضورؐ نے فرمایا:۔ اخلاق سنوار لے تیرا ایمان مکمل ہو جائے گا۔
سائل نے عرض کیا:۔ میں اطاعت گذاروں میں سے ہونا چاہتا ہوں۔
حضورؐ نے فرمایا:۔ اپنے فرائض ادا کرتے رہو تیرا مُطیع میں شمار ہو جائے گا۔
سائل:۔ میں خدا سے اس حال میں ملنا چاہتا ہوں کہ تمام گناہوں سے پاک و صاف ہوں۔
حضورؐ نے فرمایا:۔ تو جنابت سے غسل کیا کر اس کی برکت سے گناہوں سے پاک اٹھے گا۔
سائل:۔ میں چاہتا ہوں حشر میں نور کے ساتھ اٹھایا جاؤں۔
حضورؐ نے فرمایا:۔ تو کسی پر ظلم نہ کر قیامت کے دن نور میں اٹھے گا۔
سائل:۔ میں چاہتا ہوں خدا مجھ پر رحم کرے۔
حضورؐ نے فرمایا:۔ تو اپنی جان پر اور خلق خدا پر رحم کر، خدا تجھ پر رحم کرے گا۔
سائل:۔ میں چاہتا ہوں میرے گناہ کم ہوں۔
حضورؐ نے فرمایا:۔ استغفار کثرت سے پڑھا کر تیرے گناہ کمتر ہو جائیں گے۔
سائل:۔ میرے رزق میں زیادتی ہو۔
حضورؐ: ہمیشہ طہارت کے ساتھ رہ تیرے رزق میں برکت ہوگی۔
سائل: میں چاہتا ہوں خدا و رسول کا دوست بن جاؤں۔
حضورؐ:۔ جو خدا و رسول کو پسند ہے وہ پسند کر جو خدا و رسول کو ناپسند ہے تو اسے ناپسند کر خدا و رسول کا دوست بن جائے گا۔
سائل:۔ میں خدا کے غضب سے بچنا چاہتا ہوں۔
حضورؐ:۔ تو کسی پر بے جا غصہ نہ کر تو خدا کے غضب و ناراضی سے بچے گا۔
سائل:۔ میں خدا کے دربار میں مستجاب الدعوات بننا چاہتا ہوں۔
حضورؐ:۔ تو خدا کی حرام چیزوں اور باتوں سے بچ تو مستجاب الدعوات بن جائے گا۔

تعمیر حیات
لکھنؤ
پندرہ روزہ

شعبۂ تعمیر و ترقی دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

۲۵ مارچ سنہ ۱۹۷۶ء مطابق ۲۳ ربیع الاول سنہ ۱۳۹۶ھ
فی شمارہ: ۵۰ پیسے —— سالانہ: بارہ روپئے
جلد نمبر ۱۳ —— شمارہ نمبر ۱۰

اسحٰق جلیس ندوی

یوم رحمتِ عالمؐ

ہفت روزہ صدق جدید لکھنؤ کی ۲۰ فروری سنہ ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں "ایک ضروری تجویز" کے عنوان سے یہ مراسلہ شائع ہوا ہے:۔

"ہم لوگ اسلام کو عملی شکل میں تو کیا پیش کرتے کم از کم اتنا بھی نہ کر سکے کہ ہم وطنوں کے سامنے عوامی پیمانہ پر ہر زبان میں اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کا تعارف ہی کراتے ایسیوں ادارے قائم ہوتے جا رہے ہیں لیکن یہ ضرورت اپنی جگہ پر قائم ہے۔ اس سلسلے میں بندۂ ناکارہ کی یہ تجویز ہے کہ کم از کم میلاد النبیؐ کے موقع پر ملک کی تمام زبانوں کے کم از کم ایک روزنامے میں اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے عنوان سے سپلیمنٹ (ضمیمہ) شائع کروانے کا انتظام کیا جائے۔
اللہ کرے دل میں اتر جائے مری بات
(ابن غوری بھونگر)

اس تجویز کے مفید و اہم ہونے سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو، لیکن جو ملت چراغاں، جلسے جلوس اور بے سود نمود و نمائش پر ہزاروں روپے صرف کرنے کی عادی ہو اسے اس قسم کی تعمیری اور ضروری تجاویز پر غور و عمل کی فرصت کہاں۔

اس ملک میں مسلمان کم و بیش ایک ہزار سال سے رہتے ہیں، برادرانِ وطن سے بازار، محلے، دفتر، اسکول، کالج غرض قدم قدم پر انہیں واسطہ پڑتا ہے لیکن اس کے باوجود غیر مسلموں کی خاصی تعداد اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں خطرناک غلط فہمیوں کا شکار ہے۔ مسلمانوں سے بُعد و نفرت میں وہ اس حد تک مبتلا ہے کہ ان کے نزدیک مسلمان ایک شقی و خائن، شریف و با اصول انسان نہیں ہو سکتا۔ اس بُعد و نفرت کی آگ میں انگریزوں کی ڈپلومیسی اور ماضی کی سیاسی جد و جہد نے تیل کا کام کیا۔

برادرانِ وطن کی ایک محدود تعداد مسلمانوں سے نفرت نہیں کرتی ہے تاہم وہ اسلام کی دعوت اور پیغمبر اسلام کی تعلیمات سے قطعاً نا آشنا ہے۔ وہ امت جس کے نبیؐ نے "بلغوا عنی ولو آیۃ" فرمایا، "الا فلیبلغ الشاھد الغائب" ارشاد فرمایا، جہنم کی طرف لپکنے والے انسانوں کو کھینچ کھینچ کر ہلاکت سے بچایا، دنیا کے تمام انسانوں کو خدا کا کنبہ قرار دیا۔ اس امت نے رحمتِ عالمؐ کے یوم ولادت کو ان کی تعلیمات و ارشادات کی اشاعت و تبلیغ کا ذریعہ بنانے کے بجائے اپنے ذوق و نظر کی تسکین کا سامان اور اپنی تفریح کا مشغلہ بنا لیا ہے۔ بیسویں صدی کی دنیا کے انسانوں کے کرب کا علاج اور زخم کا مرہم شفاخانۂ نبویؐ ہی سے مہیا ہو سکتا ہے لیکن اس نسخۂ کیمیا کے امین و وارث انسانی برادری تک اسے پہونچانے میں مجرمانہ غفلت برت کر ...
... ایک طرف تو عالمِ انسانیت کو فیضِ نبوت سے محروم کئے ہوئے ہیں تو دوسری طرف خود اپنے ملّی وجود کو خطرے میں ڈال رہے ہیں۔

مسلمانوں کی اس غفلت نے اندلس میں ان کی آٹھ سو سالہ شان و شوکت، اقتدار و حکمرانی کے باوجود انہیں بے نام و نشان کر دیا۔ اندلس کی سینکڑوں مسجدیں صدیوں سے اذان کو ترس رہی ہیں، اندلس میں مسلمانوں کے زوال کے بعد وہ عیسائیوں کے ہاتھوں جس ظلم و ستم کا نشانہ بنے اس کی نظیر و مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اندلس میں مسلمانوں کی تباہی، ان کے اقتدار و حکومت کے خاتمے اور ان کے وجود کے نابود ہو جانے میں مختلف عوامل کام کر رہے تھے لیکن گہری نظر سے تاریخ کا تجزیہ کیجئے تو روزِ روشن کی طرح یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ مسلمانوں نے اپنے دورِ عروج و اقبال میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت، پیغمبر اسلامؐ کی سیرت و تعلیمات کو اپنے برادرانِ وطن تک پہونچانے اور ان کے دل و دماغ کو دین کی دعوت سے متاثر کرنے میں بڑی غفلت برتی یہی وجہ تھی عیسائیت اپنے ماضی کی آمریخا اور مسلمانوں کی ان پر فتحیابی کا داغ نسل در نسل منتقل کرتی رہی اور ہر آنے والی نسل اسلام کی اعلیٰ روایات، پیغمبر اسلامؐ کی پاکیزہ سیرت سے بے خبر مسلمانوں سے انتقام لینے اور انہیں نیست و نابود کر دینے کے جذبے سے سرشار ہوتی گئی۔ تاریخ شاہد ہے کہ اندلس کے مسلمانوں پر وہ گذری کہ جس کا وہم و خیال بھی کبھی انھیں اپنے دورِ عروج میں نہ ہوا ہوگا۔

برصغیر کی ہزار سالہ تاریخ میں اور اندلس کے ہشت صد سالہ واقعات میں حیرت انگیز مماثلت ہے۔ امت مسلمہ نے اپنی اس ذمہ داری کو اس ملک میں محسوس نہیں کیا جو خیر امت کی حیثیت سے اس پر خدا اور رسولؐ کی طرف سے عائد کی گئی تھی۔ اس نے "بار بار" غنی کوشش کر عالم دوبارہ نیست، ۸۰۰ کا اپنے دورِ اقبال میں مظاہرہ کیا، مسلمان اپنے سطوت و اقتدار کو دائمی اور ابدی سمجھتے رہے۔ ان میں بعض ایسے بزرجمہر بھی گذرے جنھوں نے اس ملک کے انسانوں کے باہمی اتحاد کے لئے ان طریقوں کو اپنایا جو مزید ہلاکت و تباہی اور انسانوں کو نجات کے بجائے عذاب کی طرف لے جانے والا تھا، اکبر کا دین الٰہی اس کا ایک نمونہ ہے۔

چند بوریا نشین فقراء اور صوفیاء کے علاوہ کسی کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ وہ اس وسیع و عریض خطۂ زمین پر بسنے والے انسانوں کو اسی پاکیزہ زندگی سے آشنا کرتا جو خود عمل بھی تھی اور ذریعۂ فلاح و نجات بھی۔ جو اس دنیا میں بھی سکون و عافیت کی ضمانت تھی اور آخرت میں بھی بلندیٔ درجات کا واحد ذریعہ —— تاریخ کے اوراق الٹے گئے اور عروج و اقبال کا آفتاب جب مائل بہ زوال ہوا تو ہم ایک ایسی اکثریت کے درمیان گھرے تھے جو ہم سے، ہمارے دین سے اور ہمارے اس نبیؐ سے نا آشنا تھی جو رحمتِ عالمؐ بھی تھا اور محسنِ انسانیتؐ بھی —— ان حالات میں ماضی کی کوتاہی کی تلافی اس ملک میں ہمارا دن رات کا مشغلہ اور وظیفۂ زندگی بن جانا چاہئے تھا مگر کارواں اب بھی احساسِ زیاں سے محروم ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ کارواں کسی مخصوص ایمان و عقیدہ، نظامِ حیات اور اعلیٰ مقصدِ زندگی کے حامل بابصیرت افراد پر مشتمل نہیں بلکہ حقائق سے بے خبر اپنے ماضی، حال اور مستقبل سے بے نیاز، اپنے مقصدِ وجود سے نا آشنا اور نظم و ضبط، حکمت و تدبر سے عاری انسانوں کا ایک ریوڑ ہے جسے ہر طالع آزما جہاں چاہتا ہے ہانکتا ہے اور تباہی کے جس گڑھے میں چاہتا ہے ڈال دیتا ہے۔ یہ ہر سامری کے پیچھے چلنے پر آمادہ اور ہر نادان دوست کو قائد و رہنما بنانے پر تُلا ہو۔ ملتِ اسلامیہ کی تباہی اور اس کے نتیجے میں عالمِ انسانیت کی پامالی کا یہ تسلسل برابر جاری ہے۔

کیا رحمتِ عالم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا یوم ولادت اس تزک و احتشام سے منانے والے کبھی ٹھنڈے دل سے اس پر غور کریں گے کہ یہ دن یوم احتساب بھی ہے۔ احتساب اپنا اپنی جماعت کا اس نقطۂ نظر سے کہ فرد نے یا جماعت نے دعوتِ دین کی اشاعت اور محسنِ انسانیتؐ کی مثالی سیرت کے تعارف کا حق کہاں تک ادا کیا۔ یہ اسوہ کو انفرادی اور اجتماعی شکل میں کہاں تک برتا گیا جس کا نمونہ دیکھ کر مخالفین دوست بن جاتے تھے، دشمن جان نثار ہو جاتے تھے، غلط فہمیوں کے شکار ندامت کے آنسو بہاتے تھے، زہر پلانے والے تلافیٔ مافات کی کوشش میں لگ جاتے تھے۔

مسلمانوں کو سیرتِ پاکؐ پر جلسوں اور جلوسوں کے یہ مظاہرے، عید میلاد النبیؐ کی خوشی میں یہ میلہ، یہ رنگ و نور، یہ آرائش، سجاوٹیں اور قوالیاں بہت مبارک، لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ دنیا کے عام انسانوں تک ایسے انداز میں جس سے وہ متاثر ہوں اور ان کا دل دینِ حق کی حقانیت کی گواہی دے یا کم از کم ان کے جذبۂ انتقام و ضرر رسانی کو برک لگے۔ ان مقاصد میں عید میلاد النبیؐ کے یہ پروگرام کہاں تک مفید بن سکتے ہیں۔؟

یہ وہ سوال ہے جس پر ہمیں سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا۔
جوشِ وجذبات کے آندھی طوفان، آوارہ گرد و غبار تو اٹھا سکتے ہیں، مگر تعمیرِ ملت اور فلاحِ انسانیت کی مستحکم عمارت سنجیدگی، دوربینی اور حقیقت پسندی کی بنیادوں پر ہی قائم رہ سکتی ہے۔

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
ترا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ

مولانا عبد الباری ندوی کی کتاب

"مذہب اور سائنس"

از: ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی ــــ سابق وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی

اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کے علاوہ جامعہ عثمانیہ کی ایک اور امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ اس نے جدید و قدیم سائنس اور روایتی علوم یعنی معقولات اور منقولات کی تفریق ختم کر کے ایک ایسی درسگاہ بنانے کی کوشش کی جس میں علم کو بحیثیت مجموعی ایک وحدت کے طور پر پڑھایا اور سیکھا جائے۔ اسی اصول کے تحت برصغیر کے تمام گوشوں سے ایسے منتخب علما جمع کئے گئے جو علم کی کسی ایک شاخ کے ماہر ہونے کے علاوہ وسیع نظر رکھتے اور مختلف شاخوں کے باہمی ربط اور ایک دوسرے پر ان کے اثرات سے بخوبی واقف تھے یہی وجہ ہے کہ سائنس، آرٹس، انجنیری اور طب وغیرہ مضامین کے شعبوں (فیکلٹیوں) کے ساتھ ساتھ انہی کے طرز پر ایک فیکلٹی دینیات کی بھی بنائی گئی اور اسی فیکلٹی کے طلبا کو سائنس اور آرٹس کے مضامین سے واقف کرایا گیا۔ اسی طرح ان جدید علوم کے طلبا کے لئے دینیات کی تعلیم بھی بی۔ اے کے درجہ تک لازمی قرار دی گئی جس میں اسلام کے عقائد اور ارکان ہی کی تعلیم نہیں بلکہ مذہب کے بنیادی اصول اور اس کا فلسفہ بھی بتایا جاتا تھا اور سائنس کے نام پر جو غلط فہمیاں پیدا کر کے گمراہی اور الحاد پھیلایا جا رہا تھا اس کی تردید کی جاتی تھی۔

خوش قسمتی سے دین و دانش کے اسی مضمون کو پڑھانے کے لئے مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم و مغفور جیسا باکمال استاد میسر آگیا تھا جن کی تفہیم اور انداز بیان اس قدر دلنشیں اور دلکش تھا کہ تمام طلبا ان کے درسوں میں جوق در جوق شریک ہوتے اور ان کے لکچروں کو غیر معمولی انہماک کے ساتھ سنا کرتے تھے۔ راقم الحروف کو بھی ان کی شاگردی کی سعادت نصیب ہوئی تھی اور انہی کے توسط سے حضرت مولانا عبد الباری ندوی مدظلہ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا، جامعہ میں کم و بیش بیس سال تک مولانا کی رفاقت حاصل رہی، حضرت شعبۂ فلسفہ سے متعلق تھے اور میں شعبۂ ریاضی سے۔ حضرت مولانا قدیم و جدید فلسفہ اور علم الکلام سے تو اچھی طرح واقف ہی تھے لیکن اس کے ساتھ وہ جدید سائنس کے اہم اصول اور نتائج اور فلسفہ اور کلام پر ان کے اثرات سے بھی واقف ہونا چاہتے تھے ادھر میں نظریہ اضافیت اور کوانٹم (QUANTUM) کے ریاضیاتی نظریوں پر درس دیا کرتا تھا اور ظاہر ہے کہ فلسفہ اور کلام پر ان دونوں نظریوں کا بڑا گہرا اثر مرتب ہو رہا تھا، اسی تعلق سے مجھے حضرت مولانا کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا اور ان مسائل پر اکثر گفتگو رہی۔ گردشِ ایام کے سبب گذشتہ بیس سال کے دوران حضرت مولانا سے نیاز تو حاصل نہیں ہو سکا البتہ وقتاً فوقتاً خط و کتابت کے ذریعے یہ معلوم ہوتا رہا کہ موصوف انہی مسائل پر غور و فکر کرنے کے بعد فلسفہ، کلام اور سائنس کے باہمی تعلق اور اثرات پر ایک کتاب کی تصنیف میں مصروف ہیں۔ چند ماہ قبل حضرت مولانا نے بذریعہ خط ارشاد فرمایا کہ اس کتاب پر مقدمہ تحریر کر دوں۔ حضرت مولانا کی نظر عنایت تو شروع ہی سے مبذول رہی ہے لیکن میرے لئے یہ مشکل آ پڑی ہے کہ میں یہ جسارت کس طرح کروں۔ بہرحال جب حضرت مولانا نے از راہ ذرہ نوازی یہ سعادت بخشی ہے تو اس کو قبول نہ کرنا کفران نعمت کے مترادف ہوتا۔ امتثال امر کے طور پر یہ چند سطریں لکھ رہا ہوں۔

یوں تو میں ایک عرصے سے واقف تھا کہ حضرت مولانا کس گہری نظر سے ان حقائق کا مطالعہ کر رہے ہیں، جو فلسفہ، کلام اور سائنس کے امتزاج سے منکشف ہو رہے ہیں لیکن اس کتاب کے مسودہ کو پڑھنے کے بعد ہی پتہ چلا کہ حضرت مولانا کا مطالعہ کس قدر وسیع رہا ہے، اور انہوں نے قدیم یونانی فلسفے سے لے کر آج تک بڑے بڑے علما اور حکما کی اصل تصنیفوں اور مقالات سے اپنے موضوع کے متعلق کس طرح قیمتی مواد حاصل کیا ہے اور پھر اس مواد کی تحلیل اور تشریح کے بعد ایک مدلل پیرایہ میں کیسے صحیح نتیجے اخذ کئے ہیں۔

راقم الحروف نے بھی گذشتہ ۲۵-۳۰ سال کے دوران زمان و مکان، جبر و قدر اور سائنس اور مذہب کے متعلق متعدد تقریریں کی ہیں اور متفرق مضامین لکھے ہیں جو مختلف رسالوں میں شائع ہوئے۔ اس لئے حضرت مولانا کی کتاب کو پڑھ کر ایک گونہ ہمت افزائی اور مسرت ہوئی کہ دونوں کے خیالات میں کس قدر توافق اور ہم آہنگی ہے۔ تعجب اس لئے نہیں ہوا کہ دونوں کا علم اور طرز فکر ایک ہی مبدأ فیض سے حاصل ہوا ہے۔

حضرت مولانا نے بحث کا آغاز اس نکتہ سے کیا ہے کہ انسان کو بقول غالب ؎

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں

یا بقول اقبالؔ ؎

طلسم بود و عدم جس کا نام ہے آدم

اقبالؔ نے "اسرار خودی" میں تفصیل سے بتایا ہے کہ انسانیت اور خودی کی تکمیل تخلیق مقاصد ہی سے ہوتی ہے اور حضرت مولانا عبد الباری بھی نہایت شرح و بسط کے ساتھ یہ بتاتے ہیں کہ یہی "نامحدود طلبی" انسان کا طرۂ امتیاز ہے اور اس مسلسل تلاش اور جستجو کا دار و مدار اس کے فطری "شوقِ غیب" پر ہوتا ہے۔ اسی ایمان بالغیب کا تقاضا ہے کہ انسان نہ تو علم میں کسی ایسی حد پر ٹھیر نا گوارا کرتا ہے جس کے آگے کوئی جہل باقی رہ جائے اور نہ قوت و قدرت کے کسی ایسے درجہ پر قانع رہتا ہے جس کے بعد کوئی چیز اس کی طاقت سے باہر رہ جائے اسی لئے قرآن میں انسان کو "خلیفۃ اللہ فی الارض" کہا گیا ہے، انسان کو جس غیب کا علم ہے وہ اعتباری اور اضافی ہے اور اسی کائنات اور اس کی درمیانی حالتوں تک محدود ہے، غیب مطلق اور تخلیق کائنات کی ابتدا اور انتہا کے متعلق اس کو فلسفہ اور سائنس کی مدد سے کچھ بھی نہیں معلوم ہو سکتا کیونکہ عقل محض اور حواس انسانی کی رسائی اس حد تک نہیں ہے۔

اس کے بعد مولانا نے متعدد صفحات پر پھیلی ہوئی ایک طویل تشریح بیان فرمائی ہے جس میں بڑے بڑے سائنسدانوں کے مقولوں کی مدد سے مادہ اور زمان و مکان کے متعلق جدید تصور پیش کئے گئے ہیں اور یہ بتایا گیا ہے کہ اب نہ مادہ ایسی ٹھوس شے ہے اور نہ زمان و مکان ایسے مطلق تصور ہیں جیسے ۱۹ ویں صدی کے آخر تک سمجھا جاتا تھا، اس ضمن میں حضرت مولانا نے راقم الحروف سے ایک گفتگو کا بھی حوالہ دیا ہے جس میں کہا گیا کہ نظریہ اضافیت اور "مکان۔ زمان" کے جدید تصور کو "کما حقہ" سمجھنے کے لئے علم ریاضی سے واقفیت کی ضرورت ہے۔ اس جملہ میں سب سے اہم اور کلیدی لفظ "کما حقہ" ہے اور یہ حقیقت آج بھی اسی طرح صحیح ہے جس طرح حضرت مولانا سے گفتگو کے وقت صحیح تھی، چنانچہ اس وقت کا کچھ اندازہ اس ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ اکثر فلسفی جو ریاضیات سے پوری طرح واقف نہیں ہوتے اس غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں کہ نظریہ اضافیت نے زمان کو مکان کا ایک جزو بنا دیا ہے حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے بلکہ مکان اور زمان دونوں بھی اجزا ہیں ایک تیسرے کل کے جس کو "مکان ــ زمان ، مسلسلہ" (SPACE-TIME-CONTINUUM) کہتے ہیں اور جو ایک چار ابعادی سمتیہ (FOUR — DIMENSIONAL VECTOR) ہے اس کو عام فہم زبان میں ٹھیک ٹھیک بیان کرنا امر محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ کچھ تشریح اس طرح کی جا سکتی ہے کہ اگر ایک ہی واقعہ کو دو مختلف مشاہد جو ایک دوسرے کی اضافت سے متحرک ہوں، مشاہدہ کریں تو اس مقابلہ کے لئے (LORENTZ) کا جو تحویل (TRANSFORMETION) استعمال کرنا پڑے گا اس کے فارمولوں میں نہ صرف مکان کے فارمولے میں زمان بھی داخل ہوگا بلکہ زمان کے فارمولے میں مکان بھی شامل ہوگا، یعنی مکان اور زمان دونوں ایک دوسرے پر منحصر ہوں گے۔ نیوٹن کے نظریہ میں یہ بات نہیں تھی بلکہ زمان بالکل مطلق تھا اور دو مختلف مشاہدین کے مقام یا حرکت کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا، اور زمان کے فارمولے میں مکان کبھی شامل نہیں ہوتا تھا، اگرچہ مکان کے فارمولے میں زمان شامل ہوتا تھا، ایک ریاضی داں کہے گا کہ بس "اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا"۔ لیکن غیر ریاضی داں شاید اس کو "اتنی سی بات" ہی ماننے کے لئے تیار نہ ہوں، بلکہ بہت ممکن ہے اس "تشریح" کو بھی تشنہ اور تشریح طلب سمجھیں۔

بہرحال پیش نظر کتاب میں جو نتیجے اخذ کئے گئے ہیں چونکہ ان کا سارا دار و مدار مادہ، توانائی اور زمان و مکان کے جدید تصورات پر ہے اور اگرچہ ان تصورات کو مولانا نے نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمایا ہے تاہم مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان تصورات کو یہاں مختصر طور پر ایک جگہ پیش کر دیا جائے تاکہ قارئین کو اصل کتاب کے مطالعہ میں سہولت ہو۔

جب نیوٹن نے سترہویں صدی میں قانون تجاذب کا انکشاف کیا اور علم حرکت کی مدوّن کی تواں قوانین . . . . . کا اطلاق نہ صرف روئے زمین پر پیش آنے والے واقعات پر کیا گیا بلکہ نظام شمسی کے سیاروں اور دوسرے مظاہر پر بھی اس کو وسعت دی گئی فرانس کے مشہور ریاضی داں لاپلاس نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اس کائنات کی میکانکس ایک ہی ہو سکتی ہے اور اسی میکانکس کو نیوٹن نے دریافت

←

کر لیا ہے۔ اس کا مطلب یہ لیا گیا، اب اس کے بعد طبیعی سائنس میں کسی کے لئے کچھ کرنا باقی نہیں۔ انیسویں صدی میں اس میکانکس کی جڑیں اس قدر مضبوط ہو گئیں کہ نہ صرف طبیعی سائنس بلکہ حیاتی علوم میں بھی اس کا اطلاق کیا جانے لگا اور انسانی اعضا بلکہ دماغ کے افعال کی توجیہ بھی میکانی اصول پر ہونے لگی اور یہ سمجھا جانے لگا کہ جس سائنس کی بنیاد اس میکانی اصول پر نہ ہو تو وہ باضابطہ سائنس ہی نہیں ہو سکتی۔

علوم فلکیات، طبیعیات، کیمیا اور حیاتیات میں ۱۹ ویں صدی کی غیر معمولی ترقی کی وجہ سے مادیت اور دہریت کو زبردست تقویت پہنچی اور ظاہر بیں لوگوں نے یہ سمجھنا شروع کیا کہ سائنس نے مذہب کی جڑیں کھوکھلی کر دی ہیں کیونکہ اس میکانکس کی بموجب کائنات میں علت و معلول کا ایک سلسلہ کارفرما ہے جس کی بنا پر اس کی تخلیق بھی ہوئی اور تشکیل بھی ہو رہی ہے، اور نہ تو کسی خالق کی ضرورت ہے اور نہ قیوم کی۔

علمی دنیا کا یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ جب نیوٹن کے نظریوں پر مبنی طبیعیات انیسویں صدی میں اپنے عروج پر پہونچ رہی تھی، عین اسی زمانے میں پے در پے چند ایسے تجربے اور مشاہدے ہوئے کہ خود اس علم کی بنیادیں ہل گئیں اور علم طبیعیات میں ایک ہمہ گیر انقلاب رونما ہوا، مادہ اور توانائی ذرہ اور موج، جوہر اور عنصر، زمان و مکان اور علت و معلول جیسے بنیادی تصور ہی سرے سے بدل گئے اور خود قوانین قدرت کا بھی ایک نیا مفہوم لیا جانے لگا، ان تغیرات نے نیوٹن اور میکسویل کی طبیعیات کی بجائے اس جدید طبیعیات کی تشکیل کی جس کی بنیاد کوانٹم اور اضافیت کے نظریوں پر رکھی گئی ہے۔

انیسویں صدی کی طبیعیات میں مادہ اور توانائی ایک دوسرے کے متضاد تصور تھے۔ مادہ کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ وہ ایک مجسم شے ہے جو ایک محدود فضا کو بلا شرکت غیرے احاطہ کرتی ہے اور جس کا ایک مستقل وزن ہوتا ہے جس کو کم و بیش یا معدوم نہیں کیا جا سکتا جب کوئی مادی شے حرکت کرتی ہے تو وہ ایک ہی خط میں ایک ذرہ کی طرح حرکت کرتی ہے، آواز یا روشنی کی موجوں کی طرح پوری فضا میں نہیں پھیل جاتی۔ اس کے برخلاف روشنی اور توانائی کے متعلق یہ خیال تھا کہ نہ تو وہ کوئی مجسم شے ہے اور نہ کسی محدود فضا کو بلا شرکت غیرے گھیرتی ہے، اس کا کوئی وزن نہیں ہوتا اور وہ ذرہ کی طرح حرکت نہیں کرتی بلکہ موجوں کی شکل میں آگے بڑھتی ہے۔ جدید طبیعیات میں مادہ اور توانائی کا یہ اختلاف ختم ہو گیا ہے اور تجربوں سے ثابت ہو گیا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی مختلف شکلیں ہیں کبھی مادہ توانائی میں تبدیل ہو جاتا ہے اور کبھی توانائی مادہ میں، کسی مادی شے کی کمیت مستقل نہیں بلکہ اس کی حرکت پر منحصر ہوتی ہے اور آگے رفتار کے ساتھ گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ ایک مادی شے کبھی ذرے کی طرح ایک خاص خط میں حرکت کرتی ہے اور کبھی موجوں کی طرح پھیلتی ہوئی آگے بڑھتی ہے، مادہ کے توانائی میں منتقل ہونے کا یہی اصل اصول ہے جس کی بنا پر ایٹم بم بنایا گیا ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز یعنی ۱۹۰۰ء میں پلانک (PLANCK) نے کوانٹم (QUANTUM) کا انکشاف کیا اور بتایا کہ توانائی اور مادی نظام کی حالت میں تبدیلی مسلسل نہیں بلکہ ایک خاص قلیل ترین مقدار یعنی کوانٹم کے اضعاف (MULTIPLES) کے تناسب ہوتی ہے، اس انکشاف کے بعد قدیم ترین زمانے سے طبیعی کائنات میں تغیر و تبدل کے مسلسل اور تدریجی ہونے کا جو تصور چلا آ رہا تھا وہ ختم ہو گیا اور اس کی وجہ سے نیوٹن کی میکانکس میں ایک غیر معمولی انقلاب رونما ہوا۔

ایٹم (جوہر) کے متعلق ۱۸۹۵ء تک یہی سمجھا جاتا تھا کہ وہ مادہ کا سب سے چھوٹا ذرہ ہے جس کی مزید تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس کے بعد پتہ چلا کہ ہر ایٹم کے اندر بہت سے اور چھوٹے ذرے ہوتے ہیں، جن کو الکٹرون، پروٹون اور نیوٹرون کہتے ہیں۔ کسی ایٹم کا مادہ مسلسل پھیلا ہوا نہیں ہوتا بلکہ یہ ذرے اس کے اندر نظام شمسی کی طرح ترتیب دیئے ہوئے ہوتے اور چند معینہ مداروں پر حرکت کرتے رہتے ہیں۔ ایٹم کے مختلف ذروں کے درمیان اسی طرح وسیع خلا ہوتا ہے، جیسے سورج اور اس کے سیاروں کے درمیان، ایٹم کے مرکزی حصہ میں جس کو "نیوکلیس" کہا جاتا ہے، اس کا تقریباً تمام مادہ مرتکز ہوتا ہے اور اسی کی شکست و ریخت سے ایٹم کی ماہیت بھی بدل جاتی ہے اور ایٹمی توانائی بھی حاصل ہوتی ہے، اب تو ایسے ذروں کی ایک کثیر تعداد دریافت ہوئی ہے جو دو مادی ذروں یا ایک مادی ذرہ اور شعاع (RADIATION) کے باہمی تعامل کے دوران ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

کیمیائی عناصر کے متعلق سابقہ تصور یہ تھا کہ وہ ایک خاص قسم کے مادہ سے متعلق ہوتے ہیں اور ان کی ہیئت اور ماہیت ہمیشہ ایک ہی ہوتی ہے جیسے ہائیڈروجن یا آکسیجن یا سوڈیم وغیرہ، چند سال قبل تک خیال تھا کہ ایسے کیمیائی عنصر کی تعداد ۹۲ ہے اور ایک عنصر کو دوسرے عنصر میں تبدیل کرنا وہی امر محال ہے جس کی تلاش میں ازمنہ وسطی میں متعدد کیمیا گروں نے اپنی عمریں ضائع کیں لیکن اصل کیمیا گری تجربہ خانہ میں ہر وقت کی جا رہی ہے اور بعض عناصر میں قدرتی طور پر بھی ہوتی رہتی ہے، ایک عنصر کے مختلف ہیروپ ہوتے ہیں۔ جن کو (ISOTOPE) کہا جاتا ہے اور تجربہ خانہ میں مصنوعی طور پر نئے عنصر (ELEMENTS) بلکہ نئے عناصر بھی بنائے جا رہے ہیں اور گذشتہ تیس سال میں تقریباً دس نئے عنصر یورینیم سے اوپر بنائے جا چکے ہیں۔ اسی مرحلہ پر زمان و مکان کے جدید تصور کو بیان کرنا ضروری ہے، آئن سٹائن نے ۱۹۰۵ء میں نظریاتی اور تجرباتی دونوں قسم کی وجوہات کی بنا پر بتایا کہ مطلق مکان اور مطلق زمان کا تصور جس کو نیوٹن اور اس سے قبل فلاسفہ اور حکما نے پیش کیا تھا۔ اب قابل قبول نہیں رہا۔ آئن سٹائن نے مثالیں دے کر واضح کیا کہ دو واقعات کا ہم وقت ہونا ایک اضافی چیز ہے، ایک مشاہد زید کے لئے جو واقعات ہم وقت ہوں ضروری نہیں کہ دوسرے مشاہد بکر کے لئے بھی وہ ہم وقت ہوں بلکہ یکے بعد دیگرے ہو سکتے ہیں، نہ صرف یہ بلکہ وقت کے بہاؤ کی شرح کا بھی ان دونوں کے لئے یکساں ہونا ضروری نہیں، غرض آئن سٹائن نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ زمان یعنی وقت . . . . . کوئی مطلق شے نہیں بلکہ اضافی ہے، ہر مشاہدہ کا ایک خاص ذاتی وقت ہوتا ہے اور اگر دو مشاہد ایک دوسرے کے اضافی حرکت کر رہے ہوں تو ان کے وقت بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے۔

اسی طرح مکان یعنی فضا بھی مطلق نہیں، بلکہ اضافی ہے کیونکہ دو متحرک اشیا کے درمیانی فاصلے کے کوئی معنی نہیں جب تک یہ نہ بتایا جائے کہ کس خاص وقت کے لئے یہ فاصلہ ناپا جا رہا ہے اور کون سا مشاہد اس فاصلے کو ناپ رہا ہے۔ اب چونکہ وقت خود اضافی ہے اس لئے فاصلہ جو وقت پر منحصر ہے، لازماً اضافی ہوگا۔

احوال و مقامات پہ موقوف ہے سب کچھ
ہر لحظہ ہے سالک کا زماں اور مکاں اور
(اقبالؔ)

غرض نظریہ اضافیت کی رو سے زمان اور مکان مطلق ایک دوسرے سے آزاد نہیں بلکہ اضافی اور ایک دوسرے پر منحصر ہیں، کائنات میں دو مختلف چیزیں مکان اور زمان نہیں بلکہ ایک ہی شے "مکان۔ زمان" پائی جاتی ہے جس میں مکان اور زمان گھل مل جاتے ہیں اور ہم حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ ہے کہ ۱۹ ویں صدی تک دنیا کا جو سہ ابعادی تصور رائج تھا اس کی بجائے اب چار ابعادی (DIMENSIONAL) مان لئے گئے ہیں کیونکہ کائنات محض مقاموں اور نقطوں کا مجموعہ نہیں بلکہ واقعات پر مشتمل ہوتی ہے اور کسی واقعہ کو متعین کرنے کے لئے صرف اس کے جائے وقوع کا بیان کرنا کافی نہیں بلکہ یہ بتانا بھی لازمی ہے کہ وہ واقعہ کس وقت ظہور میں آیا۔ نظریہ اضافیت کی بنا پر آئن سٹائن نے ایک نتیجہ یہ بھی اخذ کیا کہ ایک مشاہد کے لئے کسی بھی شے کی کمیت میں اس اجسام مشاہد کے لحاظ سے حرکت میں جو اضافہ ہوتا لازمی ہے۔ تجربے سے بھی اس نتیجہ کی تصدیق ہوئی اور اس طرح کمیت اور وزن بھی اضافی اشیا قرار پائیں۔

نیوٹن نے مکان، زمان اور کمیت کے ساتھ قوت کو بھی مطلق تصور کیا تھا، لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ مکان، زمان اور کمیت اضافی تصور ہیں، مختلف مشاہد اپنے اپنے نظام میں ان کی مختلف تخمینیں حاصل کرتے ہیں، قوت بھی چونکہ فاصلہ اور کمیت پر منحصر ہوتی ہے اس لئے اپنے نظریہ اضافیت کو توسیع دے کر آئن سٹائن نے بتایا کہ زمان ــ مکان اور کمیت کی طرح قوت بھی ایک اضافی تصور ہے بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر آئن سٹائن نے کہا کہ قوت کا علیحدہ تصور بیکار ہے اور حقیقت تک ہماری رسائی میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ قوت کوئی خارجی شے نہیں جو مکان۔ زمان سے علیحدہ ہو بلکہ اسی مکان۔ زمان کی ایک حالت ہے جو ہم کو قوت کے طور پر محسوس ہوتی ہے جتنے تجربے اور مشاہدے ہیں ان کی توجیہ مکان۔ زمان کی حالتوں کے لحاظ سے کی جا سکتی ہے، علیحدہ قوت کا مفہوم داخل کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا بلکہ مزید پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔

اس کو سمجھنے کے لئے چند مثالیں مفید ہوں گی۔ ایک دریا کا پانی پہاڑ سے نکل کر وادی میں بہتے ہوئے سمندر میں جا گرتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ دریا کو سمندر سے عشق ہے اور اس عشق کی قوت پانی کو مجبور کرتی ہے کہ سمندر میں جا گرے۔ یہ بات پیچیدہ ہے کہ یہاں عشق کی قوت کا مفہوم داخل کرنا غیر ضروری ہے اور دریا اس لئے نہیں بہتا کہ سمندر اس کو کھینچتا ہے بلکہ اس لئے بہتا ہے کہ اس مقام پر زمین کی توجیہ ہی اس طرح کی ہے اور یہ اس کے لئے آسان ترین راستہ ہے۔

اسی طرح کسی جسم کی حرکت کے متعلق یہ کہنا کہ حرکت ایک قوت کی وجہ سے ہوتی ہے غیر ضروری پیچیدگی پیدا کرتا ہے۔ بلکہ یوں سمجھنا چاہئے کہ ہم جہاں واقع ہے اس کے ارد گرد مکان۔ زمان کی حالت ہی کچھ ایسی ہے کہ جسم کا آسان ترین راستہ وہی ہے جو وہ اختیار کرتا ہے۔ زمین اگر سورج کے گرد چکر لگا رہی ہے تو اس کی یہ ضرورت ہے کہ زمین اور سورج کے درمیان تجاذب کی قوت فرض کی جائے جو زمین کو گھما رہی ہے۔ یہ کیوں نہ کہا جائے کہ سورج کے اطراف مکان۔ زمان ایک خاص حالت میں ہے اور مکان ــ زمان میں زمین اپنے آسان ترین راستہ پر جا رہی ہے اور قوت تجاذب کا کوئی وجود ہی نہیں۔

اسی قسم کی تحلیل و تشریح کے ذریعے اضافیت کے عام نظریہ کی بنا پر آئن سٹائن نے یہ نتیجہ اخذ

کیا کہ ہم جس کو "قوت" کہتے ہیں، وہ کوئی علیحدہ چیز نہیں بلکہ صرف مکاں زماں کی ہی ایک خاصیت ہے' کائنات کی ہر شے اپنے گرد و پیش کے مکاں۔زماں میں آسان ترین راستہ (GEODESIC) اختیار کرتی ہے، تمام اجسام کی حرکتیں اسی اصول کی بنا پر حاصل کیجا سکتی ہیں، اور آئن شٹائن کا یہی قانون ہے جو نئی طبیعیات میں نیوٹن کے قانون تجاذب کی جگہ استعمال کیا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ کہ آئن شٹائن کے نظریۂ اضافیت میں یہ بھی بتایا کہ مادہ کی موجودگی مکاں۔زماں کی ... خاصیتوں پر اثر انداز ہوتی ہے' تجربے، مشاہدے اور نظریے سب اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ ... مکاں۔زماں اس قسم کی "چپٹی" نہیں ہے جس کو اقلیدس کی جیومیٹری میں مان لیا گیا ہے، بلکہ ... مکاں۔زماں کی جیومیٹری "نااقلیدسی" قسم کی ہے جس میں فیثاغورث کا مشہور مسئلہ صحیح نہیں رہتا' چونکہ اقلیدسی فضا کو جس کی جیومیٹری ایک مستوی سطح (PLANE) کی جیومیٹری کے مماثل ہے "چپٹی فضا" کہتے ہیں۔ اس لئے اس نئی نااقلیدسی فضا۔مکاں۔زماں کو جس کی جیومیٹری ایک کرہ کی سطح کی جیومیٹری کے مماثل ہے، منحنی یا مڑی ہوئی (CURVED) فضا کہتے ہیں اور فضا کا یہ پیچ و خم" اب ایک مسلمہ سائنسی حقیقت ہے۔

نظریہ اضافیت کے انکشاف سے قبل مکان یعنی فضا کے متعلق خیال کیا جاتا تھا کہ اس کی کوئی انتہا نہیں ہے اگرچہ ہمارے حواس اور تجربے ایک خاص حصہ سے آگے کی خبر نہیں دیتے۔ لیکن نظریہ اضافیت کی بنا پر آئن شٹائن نے بتایا کہ.... کائنات متناہی ہے اور اس کے کسی دو نقطوں کا درمیانی فاصلہ معین ہے لیکن چونکہ کائنات کرہ یا گولے کی شکل کی ہے اس لئے اس پر کہیں کوئی حد یا کنارہ نہیں ہے اور جب تک چاہیں اس کے گرد سفر کر سکتے ہیں اسی لئے کائنات کو متناہی (FINITE) مگر غیر محدود (UNBOUNDED) کہتے ہیں یہ نتیجہ فضا کے مڑی ہوئی (CURVED) ہونے کا ایک معمولی نتیجہ ہے۔

آئن شٹائن نے نظریہ اضافیت کی بنا پر یہ ثابت کیا کہ توانائی (انرجی) بھی ایک جمود... (INERTIA) رکھتی ہے جس کو عرف عام میں وزن کہا جاتا ہے۔ مادہ اور توانائی دو مختلف اشیاء نہیں بلکہ ایک ہی شے کے دو مختلف بہروپ ہیں، روشنی کی شعاع صرف اسی وقت سیدھے خط میں جاتی ہے جب کہ فضا میں کوئی مادہ نہ ہو۔ لیکن اگر یہی شعاع کسی مادی جسم کے قریب سے گذرے تو اپنے سیدھے راستے سے مڑ جائیگی۔ آئن شٹائن نے اپنے کلیہ سے یہ بھی معلوم کیا ہوتا ہے کہ کسی مادی شے سے کس قدر توانائی اور کسی توانائی سے کس قدر مادہ حاصل ہوتا ہے۔ مادہ اور توانائی میں کوئی اساسی اختلاف نہیں ہے بلکہ ایک ہی شے کبھی ذرہ کے خواص کا اظہار کرتی ہے اور کبھی موج کے خواص کا۔

زماں و مکاں، مادہ اور توانائی، عنصر اور قوت جیسے بنیادی تصورات کے بدلنے کی وجہ سے علت و معلول کے منطقی مفہوم میں بھی فرق آگیا ہے۔ نیوٹن کی میکانکس کا ایک اہم مسئلہ یہ تھا کہ اگر کسی شے کی موجودہ حالت معلوم ہو تو اس کی سابقہ یا آئندہ حالت قطعی طور پر متعین ہو جائیگی اور محض قوانین حرکت کی بنا پر علم ریاضی کی مدد سے ازل سے ابد تک اس کی تمام حالتوں کی پیش بندی کی جا سکے گی۔ میکانکس کا یہی مسئلہ تھا جو مادہ پرستوں کے لئے حکم فیصل کا کام دیتا تھا، اور جس کی بنا پر وہ کسی خالق کائنات کے تصور کو غیر ضروری قرار دیتے تھے... کیونکہ ان کے نزدیک کائنات کی ہر حالت ہر لحہ متعین ہے اور وہ اس کے مطابق خود بخود تشکیل پاتی چلی جارہی ہے۔

لیکن کوانٹم اور اضافیت کے نظریوں کی بنا پر پروفیسر ہائی زن برگ نے ۱۹۲۶ء میں یہ بتایا کہ مظاہر فطرت میں تعین یا جبر نہیں بلکہ عدم تعین جاری و ساری ہے۔ اس کے بعد سے طبیعی سائنس کا موجودہ مسلمہ قانون یہ ہے کہ نہ صرف کائنات بلکہ اس کے کسی حصہ یہاں تک کہ کسی ایک ذرہ کا مستقبل بھی قطعی طور پر متعین نہیں ہے بلکہ وہ کئی ممکن حالتوں میں سے کوئی ایک حالت اختیار کر سکتا ہے' اس طرح قوانین قدرت تعینی (DETERMINISTIC) نہیں بلکہ اوسطی یعنی (STATISTIC) ہو جاتے ہیں۔

دراصل ہائی زن برگ کے اصول عدم تعین (PRINCIPLE OF INDETERMINACY) .... کے انکشاف سے قبل ہی بعض مشہور سائنسداں اس امر کا اعتراف کر رہے تھے کہ سائنس کے طریقوں سے اشیاء اور مظاہر کی انتہائی حقیقت یا غایت کو نہ تو دریافت کیا جا سکتا ہے نہ یہ چیز سائنس کے دائرہ عمل میں ہے، ۱۹۲۳ء کے بعد جب نیلیس بوہر (NEILS BOHR) کے کوانٹم نظریہ میں یکے بعد دیگرے متعدد غلطیاں اور خامیاں منکشف ہونے لگیں تو ۱۹۲۵ء میں نئی کوانٹم میکانکس کی بنیاد رکھتے ہوئے ہائی زن برگ اور ڈیراک نے بتایا کہ یہ غلطیاں اسی وجہ سے پیدا ہو رہی ہیں کہ سائنس کا مقصد اور اس کا طریقہ کار صحیح طور پر متعین نہیں کیا گیا۔ سائنس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ مظاہر فطرت کی اصلی اور آخری ماہیت اور حقیقت معلوم کرے بلکہ سائنس کا کام صرف یہ ہے کہ ان اشیاء اور مظاہر میں باہمی ربط اور تعلق کا پتہ چلائے۔ ڈیراک نے مثال کے طور پر کہا کہ سائنس میں یہ سوال کرنا بے معنی ہے کہ برق کی حقیقت یا ماہیت کیا ہے بلکہ صحیح سوال یہ ہوگا کہ قوت برق کا عمل کیا ہے۔

اس سے بھی آگے چلئے تو ہم دیکھیں گے کہ سائنس کے اساسی تصور میں ایک بہت بڑا انقلاب رونما ہوا، یہ انقلاب سائنس کے بنیادی قوانین کی تشکیل سے متعلق ہے۔ جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے انیسویں صدی کے ختم تک سائنس کے بنیادی قوانین استقرائی (INDUCTIVE) نوعیت کے ہوتے تھے مثلاً قانون تجاذب ہی کو لیجئے۔ یہ قانون کہ کائنات کے کسی دو مادی اجسام یا ذروں کے درمیان ایک معین مقدار کی تجاذبی قوت پائی جاتی ہے، خاص مثالوں کی مدد سے اخذ کیا گیا تھا، اسی طرح برق و مقناطیس کے قوانین، یا روشنی کے منعکس اور منعطف یا منتشر ہونے کے قوانین سب استقرائی تھے۔

لیکن ۱۹۰۵ء اور ۱۹۱۵ء میں آئن شٹائن نے اپنے خاص اور عام نظریہ اضافیت کی تشکیل کے لئے جو قانون یا مفروضے (POSTULATES) اختیار کئے وہ استقرائی نہیں بلکہ "علمیاتی" یعنی فلسفیانہ نوعیت (EPISTEMOLOGICAL) کے ہیں۔ ان مفروضوں کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ، قوانین ایسے ہونے چاہئیں جو تمام مشاہدین کے لئے "غیر متغیر" (INVARIANT) یا "ہم متغیر" (CO-VARIANT) ہوں خواہ یہ مشاہدین کسی قسم کی حالت حرکت میں کیوں نہ ہوں۔ یہ مفروضے جن پر نظریۂ اضافیت کی تشکیل کی گئی ہے، استقرائی نہیں بلکہ علمیاتی ہیں۔ اسی طرح ہائی زن برگ کا عدم تعین کا اصول جس پر جدید کوانٹم میکانکس کا دار و مدار ہے استقرائی نہیں بلکہ علمیاتی ہے۔

پروفیسر ایڈنگٹن نے سائنس کی اس نئی تحریک کو ایک بڑی دلچسپ مثال کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ فرض کرو ایک سائنسداں کسی تالاب سے ایک جال کے ذریعے مچھلیاں پکڑ رہا ہے۔ جب تمام دن کی محنت کے بعد وہ ان مچھلیوں کو جو پکڑی گئی ہیں ناپتا ہے تو بزعم خود ایک قانون کا انکشاف کرتا ہے کہ اس تالاب میں کوئی مچھلی ایک انچ طول سے کم نہیں ہے۔ اس کے اس فعل کو جب کوئی دوسرا شخص دیکھتا ہے تو اس کو بتاتا ہے کہ تمہیں اس قانون کے اخذ کرنے کے لئے تمام دن اتنی محنت کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ تم محض اپنے جال کو دیکھ کر جس کے تمام خانے ایک انچ طول کے ہیں، شروع ہی میں یہ نتیجہ اخذ کر سکتے تھے کہ اس جال سے کوئی ایسی مچھلی نہیں پکڑی جا سکتی جس کا طول ایک انچ سے کم ہو۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ قوانین فطرت کی تشکیل کے لئے علم کی نوعیت اور علم حاصل کرنے کے طریقوں پر غور کر کے استقرائی قوانین کی نسبت زیادہ دور رس اور دیرپا قوانین بنائے جا سکتے ہیں، کیونکہ کوئی استقرائی قانون تو ایک بھی مخالف مثال.... (COUNTER EXAPLE) کی بنا پر غلط ثابت ہو سکتا ہے جیسا کہ نیوٹن کا قانون تجاذب جس کو اس لئے مسترد کرنا پڑا کہ اس کی بنا پر سیارہ عطارد کا جو مدار محسوب کیا جاتا ہے وہ مشاہدہ کئے ہوئے مدار کے مقابلہ میں غلط ہے۔

طبیعی علوم کی انہی حالیہ ترقیوں کا بیان حضرت مولانا نے اکابر سائنس جیسے آئن شٹائن،... برٹرینڈ رسل، ہائی زن برگ، سر جیمز جینس اور سر آرتھر ایڈنگٹن وغیرہ کی تصنیفوں سے اقتباس کے طور پر پیش کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ مادیت اور جبر و تعین کا دور اب ختم ہو چکا ہے۔ پھر انہوں نے دے کارت کے فلسفۂ شک کو تفصیل سے بیان کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش فرمائی ہے کہ برکلے کے فلسفۂ تصوریت (IDEALISM) کو ماننے کے سوا اب کوئی چارہ نہیں رہا۔ ان فلسفوں کے متعلق یہاں کچھ کہنا بے سود اور غیر ضروری ہے کیونکہ حضرت مولانا نے ان کو اس کتاب میں نہایت خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے ایسے ہی ایک موقع کے لئے مولائے روم فرماتے ہیں ؎

چند گاہش گام آہو درخوراست
بعد ازاں خود ناف آہو رہبر است
(رومی)

بہر حال جب مادیت اور دہریت کے پرستاروں کا وہ طلسم جو انھوں نے سائنس کی بنیادوں پر قائم کیا تھا ٹوٹ گیا تو پھر کائنات کی حقیقت پر غور و فکر کرنے والوں کے لئے بمصداق "کافر نتوانی شد ناچار مسلمان شو" خدا کی ہستی پر ایمان لانے کے لئے نئی راہیں کھل گئیں اور کم از کم ایک ہمہ گیر آفاقی ذہن (UNIVERSAL MIND) کو تسلیم کرنا ناگزیر ہو گیا۔

حضرت مولانا عبد الباری نے اسی حقیقت کو اپنی کتاب میں بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے اور ان اصحاب کے لئے جو سائنس اور ٹکنالوجی کی حالیہ غیر معمولی ترقی سے مرعوب اور متاثر ہو کر ایمان کی کمزوری کا شکار ہو رہے ہیں، یقین محکم حاصل کرنے اور دنیا و آخرت میں نجات پانے کا سامان مہیا کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حضرت مولانا کا یہ ایک نہایت اہم اور قابل تحسین کارنامہ ہے، جو انہوں نے اس کبر سنی میں اس قدر محنت شاقہ برداشت کر کے انجام دیا ہے۔ اور اس کے لئے وہ یقیناً عند اللہ ماجور اور عند الناس مشکور ہوں گے۔

(مقدمہ کتاب)

حدیث کا تحریری سرمایہ عہد نبویؐ اور عصر صحابہؓ میں!

احمد علی خاں قاسمی ـ قصبہ رسول آباد ـ ضلع اناؤ

بعض یورپین مصنفین اور مشنریوں کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ صاف و شفاف مذہب اسلام پر شکوک و شبہات کا ایسا گھناؤنا خول چڑھا کر دنیا کے سامنے پیش کیا جائے جس کی وجہ سے وہ قابل نفرین اور صرف ایک افسانہ بن کے رہ جائے اپنے اس پُر فریب مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے انہوں نے اسلام پر بیشمار لغو اعتراضات کئے۔ کبھی انہوں نے یہ باور کرانا چاہا کہ اسلامی کلچر ہر نئے زمانے کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ کبھی مسلم پرسنل لا کے معاملے کو ہوا دیکر یہ ثابت کرنا چاہا کہ اسلام ایک ناقص اور نامکمل ضابطۂ حیات ہے جس میں نئے زمانے کے ساتھ مسایرت (حرکت) کرنے کی صلاحیت نہیں اور کبھی تعدد ازدواج کا سہارا لے کر اسلام کو ظالم قرار دیا اور طبقۂ نسواں کو بیزار کرنے کی بیکار کوشش کی، کبھی یہ اعتراض کیا کہ اسلامی فقہ رومن لا سے ماخوذ ہے اور اس طرح سے فقہ کی اہمیت کم کرنا چاہا۔ ان کے اس طویل سلسلہ کی ایک کڑی کو ہی علم حدیث کو قابل تشکیک بنا کر دنیا کے سامنے پیش کرنے کی ہے۔

انگریز اور تعصب پسند اشخاص بڑھ چڑھ کر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حدیث کا تحریری سرمایہ عہد نبویؐ اور عصر صحابہؓ میں وجود پذیر نہ ہوا تھا بلکہ آنحضرتؐ کے سو سال بعد تابعین کے دور میں حضرت عمر بن عبد العزیز کے حکم سے ابن شہاب زہری کے ذریعہ کاغذی سفینوں پر لایا گیا۔ بعض کم علموں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ حدیث کی کتابی تدوین امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کے دور میں ہوئی۔

بہر کیف اپنے مزعومہ باطلہ کے مطابق انہوں نے حدیث کی صحت و وثوق پر شکوک و شبہات کا گہرا اور دبیز پردہ ڈال کر قابل شک و شبہ بنانا چاہا اور ساتھ ہی اس پر فریب مکر کا بھی پروپیگنڈہ کرنا چاہا کہ جس فن اور علم پر سو یا دو سو سال گذر جائیں اور بعد میں اس کو تحریری شکل میں لایا جائے تو یقیناً وہ علم کمی بیشی اور نقول سے ورا اور شک و شبہات سے پاک اور مبرا نہیں ہو سکتا۔

المیہ اس کا ہے کہ اس پُر فریب نظریے سے کچھ مسلمان بھی متاثر ہوئے اور انہوں نے بھی حدیث کا انکار کر دیا۔ مجھے ان کے نام نہیں گنوانے، لیکن اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ منکرین حدیث کا ایک فرقہ وجود میں آگیا ہے جو اپنے آپ کو فرقۂ قرآنیہ کہتا ہے۔

اس مختصر مقالہ میں ان کے اسی دعویٰ باطلہ کے تار و پود اور بیخ و بن کو اکھاڑنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ یہ حقیقت آشکارا ہو جائے کہ وہ لوگ کس قدر دھوکہ میں ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ حدیث کی کتابی تدوین پہلی صدی ہجری کے اختتام پر ہوئی۔

یہ حقیقت ہے جس سے چشم پوشی ممکن نہیں کہ ابتداءً آنحضرتؐ نے حدیث کو قید تحریر میں لانے سے منع کر دیا تھا، جیسا کہ آپ کا آپکا ارشاد ہے۔

من کتب عنی شیئاً غیر القرآن فلیمحہ (جو شخص میری جانب سے قرآن کے علاوہ کچھ لکھے اس کو چاہئے کہ اُسے مٹا دے)

قرآن پاک کا نزول ہو رہا تھا قرآن پاک اور احادیث کے باہمی اختلاط والتباس کا قوی اندیشہ تھا۔ جب یہ اندیشہ ختم ہو گیا اور قرآن پاک لوگوں کے رگ و ریشہ خون کی طرح سرایت کر گیا تو آپؐ نے صحابہؓ کو کتابت حدیث کی اجازت بھی دے دی لیکن پھر بھی بعض صحابہؓ احتیاطاً حدیث کو جمع نہ کیا۔

اس ساتھ ہی اہل عرب تحریری چیز کو معیوب سمجھتے تھے اس لئے جس کے پاس کوئی تحریر ہوتی وہ اسے چھپائے رکھتا تھا۔ اہل عرب زبانی یادداشت کو ہی حفاظت و صیانت کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ تحریر میں تبدیلی ہو سکتی ہے لیکن دلوں کی تختیوں پر جو نقوش کندہ ہیں ان میں تغیر ناممکن ہی نہیں محال ہے، نیز کاتبین کی تعداد کم تھی جیسا کہ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں تصریح کی ہے،

"لان اکثرھم کانوا لایعرفون الکتابۃ"

یہ وجوہ تھے جس کی بنا پر صحابہ کرام حدیث کے اس قیمتی سرمایہ کو کاغذی سفینہ پر لانا پسند نہ کرتے تھے۔ لیکن ان اسباب کے ختم ہوتے ہی صحابہ کرامؓ اس جانب متوجہ ہوئے اور حدیث کو کتابی شکل میں لانے کی کوشش کی اور اس طرح سے دور نبویؐ میں حدیث کا سرمایہ قید تحریر میں آنا شروع ہو گیا۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے زیادہ آنحضرتؐ کے اقوال و حالات کو بیان کرنے والا کوئی نہیں، مختلف ذرائع سے یہ بات ثابت ہے کہ ان کی روایات اسی دور میں قلمبند ہو چکی تھیں۔

فتح الباری شرح بخاری شریف میں حافظ ابن حجر کے بیان کے مطابق حضرت ابو ہریرہؓ اپنی یادداشت کے لئے اپنی روایت کردہ احادیث کو قلمبند کر لیا کرتے تھے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کے مشہور شاگرد رشید بشیر بن نہیک نے ان کی روایت کردہ حدیثوں کا ایک نسخہ تیار کر کے ان کو سنایا تھا۔

عن بشیر بن نھیک قال کنت اکتب ما اسمع من ابی ھریرۃؓ فلما اردت ان افارقہ اتیت بکتابہ فقرأتہ علیہ و قلت ھذا ما سمعت منک، قال نعم

(تدوین حدیث علامہ مناظر احسن گیلانی)
(بحوالہ دارمی)

(بشیر بن نہیک روایت کرتے ہیں کہ میں جو بات بھی ابو ہریرہ سے سنتا اسے نوٹ کر لیتا جب میں نے ان کے پاس سے جدا ہونے کا ارادہ کیا تو وہ لکھی ہوئی کتاب لے کر آیا اور حضرت ابو ہریرہؓ کے سامنے پڑھی، میں نے کہا یہ وہ ہے جو میں نے آپ سے سنا۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا ہاں!)

حضرت ابو ہریرہؓ کی اس تصدیق سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی روایت کردہ حدیثوں کا نسخہ ان کے زمانے میں ہی جمع ہو چکا تھا بشیر بن نہیک کے علاوہ حضرت ابو ہریرہؓ کے مشہور زمانہ شاگرد ہمام بن منبہ نے بھی ان کی روایت کردہ احادیث کو جمع کیا تھا اور یہ نسخہ صحیفہ ہمام کے نام سے مشہور ہے یہ صحیفہ شائع بھی ہو چکا ہے، احقر کی نظروں سے کتب خانہ دار العلوم دیوبند میں یہ صحیفہ گذرا ہے۔ ان تاریخی بیانات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی مرویات ان کے زمانے ہی میں قید تحریر میں آچکی تھیں۔ حضرت ابو ہریرہ کی طرح دوسرے اکثر صحابی حضرت عبد اللہ کی روایتوں کے جمع ہونے کا ناقابل انکار ثبوت حدیث کے صفحات میں ملتا ہے۔ خود حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے۔

عن ابی ھریرۃ یقول ما من اصحاب النبی احد اکثر حدیثا منی الا ما کان عبد اللہ بن عمرو فانہ کان یکتب ولا اکتب۔

(بخاری شریف ج ا ص ۲۲)

(حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ عبد اللہ بن عمرو کے سوا کسی کو مجھ سے زیادہ حدیث یاد نہیں، ان کو اس وجہ سے زیادہ یاد ہیں کہ وہ لکھتے تھے اور میں نہیں لکھتا تھا۔)

ابو داؤد شریف کی روایت ہے کہ بعض لوگوں نے حضرت عبد اللہ بن عمرو سے کہا کہ آنحضرتؐ کبھی غصہ کی حالت میں ہوتے ہیں کبھی خوش ہوتے ہیں اور تم سب کچھ لکھ لیتے ہو۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو نے اس کے متعلق آنحضرتؐ سے سوال کیا۔

قلت یا رسول اللہ اکتب کل ما اسمع منک قال نعم، قلت فی الرضاء والغضب قال نعم، فانی لا اقول فی ذلک الا حقا۔

(ابو داؤد شریف جلد ۲)

(میں نے کہا، اے اللہ کے رسولؐ! میں جو کچھ آپ سے سنوں، قلمبند کروں۔ آپ نے کہا، ہاں۔ میں نے عرض کیا غصہ اور خوشی دونوں حالت میں؟ آپ نے فرمایا ہاں (پھر آپؐ نے دہن مبارک کی اشارہ کرتے ہوئے فرمایا) اس منہ سے حق بات کے سوا کچھ نکلتا ہی نہیں)

حضرت عبد اللہ کی روایتوں کا مجموعہ جو آپ نے آنحضرتؐ کی حیات طیبہ میں تحریر کیا تھا، محدثین میں صحیفہ صادقہ کے نام سے مشہور ہے! ایک دوسرے صحابی حضرت انسؓ جن کا شمار طبقہ مکثرین میں ہوتا ہے وہ اپنے بیٹوں سے کہا کرتے تھے،

"یا بنی قیدوا ھذا العلم"
(میرے بچو! اس علم حدیث کو قلمبند کر لیا کرو)

صرف یہی نہیں بلکہ ان کے شاگرد ابان ان کے پاس بیٹھ کر لکھتے تھے۔

"رأیت ابان یکتب عند انسؓ"
(تدوین حدیث علامہ مناظر گیلانی)
(ہم نے ابان کو دیکھا کہ حضرت انسؓ کے پاس بیٹھے لکھ رہے ہیں)

ان بیانات سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت انسؓ کی روایتیں عہد نبوت میں قلمبند ہو چکی تھیں۔

حضرت انسؓ کے صحیفہ کے علاوہ حضرت علیؓ کے صحیفہ کا بھی حدیث کی کتابوں میں تذکرہ ملتا ہے۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ حضرت علیؓ کے پاس ایک صحیفہ تھا جس کو وہ اپنی تلوار کی نیام میں رکھتے تھے اس میں متعدد احکام قلمبند تھے۔"

(بخاری شریف جلد ۲)

حضرت جابر بن عبد اللہ سے بھی بکثرت روایتیں موجود ہیں، ان کی روایات کے قلمبند ہونے کا حال سماعت فرمائیے، حافظ ابن حجر کا بیان اگر صحیح ہے، تو حضرت جابر کی روایات کے مجموعہ کو ان کے لائق شاگرد وہب بن منبہ نے تیار کیا تھا اسی طرح دوسرا مجموعہ سلیمان بن قیس نے تیار کیا تھا

(تہذیب)

عورتوں میں سب سے زیادہ روایات حضرت عائشہ صدیقہؓ کی ہیں۔ یہ بات تو پایۂ ثبوت کو نہیں پہونچتی کہ خود صدیقہ نے اپنی روایتوں کو جمع کیا تھا لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی مرویات ان کے براہ راست شاگرد اور حقیقی بہن کے لڑکے حضرت عروہ بن الزبیرؓ کے ذریعہ قلمبند ہو گئی تھیں۔ حضرت عروہؓ نے اپنے علم کو ایک کتاب میں قلمبند کیا تھا جس میں حضرت عائشہ کی روایتیں ہونا یقینی ہے۔ واقعہ حرہ میں جب کہ مدینہ لوٹا اور برباد کیا گیا آپ نے اپنی کتاب قصداً ضائع کردی، بعد کو پچھتاتے ہوئے کہتے تھے،

"لوددت انی کنت فدیتھا باھلی ومالی" (تہذیب ج ۷)

(اچھا ہوتا کہ میں اپنے اہل وعیال کو اس کتاب پر فدا کر دیتا۔)

حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ ایک کثیر الروایۃ صحابی ہیں ان کے متعلق ابن سعد میں ہے کہ آنحضرتؐ کے غلام رافع سے آنحضرتؐ کے کارنامے لکھا کرتے تھے ان کے آزاد کردہ غلام سے امام ترمذی نے اپنی کتاب العلل نقل کی ہے۔

اہل طائف نے بھی حضرت ابن عباسؓ کی حدیثوں کو تحریر کیا تھا جیسا کہ سند رجہ ذیل بیان سے واضح ہے۔

"ان نفراً قدموا علی ابن عباس من اھل الطائف بکتب من کتبہ فجعل یقرأ علیھم" (کتاب العلل ترمذی)

اسی طرح سے حضرت ابن عمرؓ کی روایات ان کے شاگرد نافع کے ذریعہ سے قلمبند ہونے کا ثبوت ملتا ہے اور امام مالکؒ ان روایتوں کو جو نافع ابن عمر کے ذریعہ سے روایت کرتے بعض لوگ انہیں سلسلۃ الذہب قرار دیتے تھے۔

آنحضرتؐ کے اقوال وافعال کی جن صحابۂ کرامؓ نے سب سے زیادہ روایات کی ہیں ان مکثرین صحابہ کی روایات کی تعداد سید سلیمان صاحب ندویؒ نے خطبات مدراس میں بتایا ہے، فہرست پیش خدمت ہے:۔

اسمائے صحابی	روایات کی تعداد
حضرت ابو ہریرہؓ	۵۳۷۴
حضرت عبد اللہ بن عباسؓ	۲۶۶۰
حضرت عائشہ صدیقہؓ	۲۲۱۰
حضرت عبد اللہ بن عمرؓ	۱۶۳
حضرت جابر بن عبد اللہؓ	۱۵۶
حضرت انس بن مالکؓ	۱۲۸۶
حضرت ابو سعید خدریؓ	۱۱۷۰

ان مکثرین صحابہ کے علاوہ اور بھی اشخاص دور نبویؐ میں نظر آتے ہیں جن کے پاس حدیث کے مختلف نسخے تھے۔ اور پھر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے موقعہ پر ابوشاہ یمنی کے لئے لکھنے کا حکم صادر فرمایا تھا،

"اکتبوا لابی شاہ"

(ابوشاہ کے لئے لکھو۔)

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے ارشادات یقیناً قلمبند ہوئے ہوں گے۔ اس کے علاوہ مرض وفات میں آپؐ نے صحابۂ کرام سے فرمایا تھا:۔

"ائتونی بکتاب اکتب لکم"

(ایک پرزہ لے آؤ میں تمہارے لئے لکھ دوں۔)

اس واقعہ میں کتابت نہیں ثابت ہے، لیکن اجازت کتابت سے انکار نہیں کیا جاسکتا اہل یمن کو آپؐ نے کچھ احکام لکھوائے تھے، نیز آپؐ کے دعوتی خطوط میں آپؐ کے ارشادات قلمبند ہوتے تھے۔

جب حدیث کا اتنا بڑا تحریری سرمایہ عہد نبوت اور عصر حاضر میں موجود تھا اور بحال مستر مین تحریری سرمایہ ہی قابل اعتماد ہوسکتا ہے۔ تو یہ کہنا کس قدر دھوکا اور علمی افلاس وغربت کا نتیجہ اور تعصب وعناد کا کرشمہ ہے کہ حدیث کی تدوین کا کام ڈھائی سو سال بعد یا امام بخاری علیہ الرحمۃ کے دور میں شروع ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اگر صحابہؓ کے حافظ اور بعد والوں نے حدیث کے قبول کرنے کی جو شرطیں بیان کیں یعنی راویوں کی زندگی کے پورے حالات اور چھان پھٹک۔ راوی ثقہ ہے یا غیر ثقہ، سطحی ہے یا غیر سطحی اس کی زندگی بے داغ ہے یا نہیں، حافظ درست ہے یا نہیں ــــ اور تلقی بالقبول کی اور شرطوں کو جو محدثین نے بتائی ہیں ان سب کو بھی دیکھا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ حدیث کا سرمایہ کمی وبیشی اور تغول سے پاک وصاف ہے۔ بعینہٖ یہ وہی علم ہے جو عصر نبویؐ اور عہد صحابہؓ میں موجود تھا۔

رباعی

دولت کی تمنا ہے تو عالم بن جا
عظمت کی تمنا ہے تو خادم بن جا
بچنے کی تمنا ہے تو مرنے سے نہ ڈر
ذلت کی تمنا ہے تو ظالم بن جا

فہیم نعمانی

اے سرزمین لکھنؤ اے قاہرہ ہمارا!

محترمی زید مجدکم

مجھے ندوہ سے دیرینہ قلبی تعلق رہا ہے، اگرچہ میں دار العلوم دیوبند سے فارغ ہوں لیکن اپنے کو حضرت مولانا سید علی میاں صاحب ندوی کی تالیفات اور دوسرے اکابرین ندوہ کی تحریروں سے مسلسل استفادہ کی بنا پر ندوہ کا ایک فرزند تصور کرتا ہوں۔

کبیر الدین فوزان

گہوارۂ ثقافت۔ تہذیب کا منارا
اے سرزمین لکھنؤ اے قاہرہ ہمارا
علم وادب کی بستی اے قرطبہ ہمارا
تیرا ہر ایک ذرہ تب میں ہے ستارا
ہر باغ میں تمہارے بغداد کے نظارے
شاہد ہیں گومتی کے یہ خوشنما کنارے
صبح ورانسی کو ہوتی ہے شرمساری
شام بہشت جیسی ہر شام ہے تمہاری
"دار العلوم" تیرا علم وادب کی گنگا
ایمان ودین کا دجلہ شعر وسخن کی جمنا
پیدا کئے ہیں جس نے کتنے ادیب شاعر
عالم، فقیہ و واعظ دانشور ومفکر
"ندوہ" رگوں میں جس کی ازہر کا خون جاری
روح نظامیہ ہے پیکر میں جس کے ساری
دنیا ودین کا ہے گویا حسین سنگم
یا فکر وآگہی کا شفاف ایک زمزم
یا کارگاہ دانش ڈھلتے ہیں جس میں انساں
یا جہل کا ہے مقتل یا نشرگاہ ایماں
یہ بوستان شبلیؒ یہ گلشن سلیمانؒ
لوٹی صدا جہاں سے فصل خزاں پشیماں
مہکی ہوئی ہے جس سے دنیائے علم وعرفاں
جشن بہار سے ہے ہر پھول آج فرحاں
آئے ہیں یہ عنادل کھنچکر یہاں وہاں سے
دل میں پیام لے کر کیا کیا کہاں کہاں سے
ہے یہ دعائے فوزاں قائم رہے خدایا
"سید علی میاں" کا تا دیر اس پہ سایا

پروفیسر مسعود حسن رضوی سے دو یادگار ملاقاتیں

محمد غفران ندوی۔ ایم۔ اے

پروفیسر صاحب سے پہلا غائبانہ تعارف خود ان کی کتاب "ہماری شاعری" سے ہوا کتاب کے انداز بیان نے اتنا متاثر کیا کہ جیسے ہی کتاب پڑھ کر ختم کی طبیعت میں شدت سے تقاضہ ہوا کہ پروفیسر مسعود حسن صاحب سے ملاقات کی جائے، اور ان سے ان کی کتاب کے متعلق تاثرات بیان کئے جائیں لیکن ان کی قیام گاہ تک رہبری کرنے والا کوئی ملا نہیں۔ اس لئے بات آئی گئی ہو گئی اور خاصہ وقت گذر گیا لیکن "ہماری شاعری" اور اس کے مصنف کا نقش دل میں جما رہا اور یہ خیال دل میں لئے رہا جب بھی پروفیسر صاحب سے ملاقات ہوگی "ہماری شاعری" سے متعلق اپنے خیالات کا ضرور اظہار کروں گا ــــ

اتفاق کی بات مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء نے مئی ۱۹۸۰ء میں "سوانح مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی صدر یار جنگ" شائع کی یہ سوانح شمس تبریز خاں صاحب نے حضرت مولانا علی میاں صاحب مدظلہ العالی کی نگرانی اور ہدایات کے مطابق تالیف کی ہے چنانچہ مولانا موصوف کا اس پر بہت ہی مبسوط اور جامع مقدمہ بھی ہے ــــ یہ سوانح جب چھپ کر تیار ہوئی تو حضرت مولانا مدظلہ نے لکھنؤ کے خاص خاص لوگوں تک اسے پہونچانے کا حکم فرمایا چنانچہ ان خاص لوگوں میں سے پروفیسر صاحب کی ذات گرامی بھی تھی حضرت مولانا نے فرمایا کہ اپنے ہاتھ سے براہ راست اس کتاب کو پہونچاؤ، تعمیل حکم میں فوراً تیار ہو گیا اور خوش بھی ہوا کہ اس بہانے آج پروفیسر صاحب سے شرف ملاقات حاصل ہوگا لیکن پروفیسر صاحب کی جائے قیام سے اب تک ناواقف تھا، اب فکر اس کی ہوئی کہ کسی واقف کار سے پروفیسر صاحب کا گھر معلوم کروں خیر کوشش اور طلب سے سب کچھ مل جاتا ہے، خدا خدا کر کے پروفیسر صاحب کا گھر مل گیا۔ گیٹ کھول کر برآمدے میں گیا اور اتفاق سے اسی کمرے کے دروازے کھٹکھٹائے جہاں پروفیسر صاحب آرام فرما رہے تھے معلوم ہوا کہ ابھی ذرا دیر پہلے لمبی نشست کے بعد اندر تشریف لے گئے تھے، طبیعت میں افسوس اور شرمندگی کا احساس ہوا کہ بہت ہی ناوقت آیا۔ آواز اور جسم دونوں سے پیرانہ سالی کے آثار نمایاں تھے، فوراً ہی کرسی پر بیٹھ گئے اور مجھے بھی بیٹھنے کا حکم دیا۔ تکلف اور معذرت کے انداز میں آنے کا سبب بیان کیا۔ بہت ہی خوشی کے ساتھ کتاب "سوانح صدر یار جنگ" ہاتھ میں لے لی اور پھر گفتگو نے اتنا طول کھینچا کہ ڈیڑھ دو گھنٹے ہو گئے دل نے کہا اب جانے کی اجازت لینی چاہئے تاکہ کچھ آرام کا بھی موقع مل سکے، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ہمارے کہنے سے مجلس برخاست ہوئی ورنہ ابھی ارادہ نہیں تھا اس کا سبب یا تو موضوع گفتگو سے دلچسپی یا آنے والے کے ساتھ اظہار محبت ومروت سے گفتگو بے حد دلچسپ اور پر از معلومات کہ دل میں پچھتا رہا تھا کہ اس سے بہت پہلے کیوں نہ آئے؟ اور ساتھ ہی ساتھ دل میں یہ بھی خیال کہ پروفیسر صاحب کی گفتگو کے دوران قلم کاغذ بھی ہونا چاہئے ورنہ لکھنؤ کی روایت وتہذیب کی زندہ تاریخ کہاں ملے گی؟ بافسوس کے ساتھ اٹھ بیٹھا اور دوبارہ زیادہ وقت لے کر آنے کا عہد کیا ــــ پروفیسر صاحب کی گفتگو اس قدر مسلسل کہ آدمی خاموشی سے سنتا رہا اور معلومات جمع کرتا جائے۔

میں نے جس وقت پروفیسر صاحب کے ہاتھ میں "سوانح" پیش کی تو دل میں خیال آیا کہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی صدر یار جنگ سے کسی پڑھے لکھے اردو داں آدمی کی ناواقفیت کا تو کوئی سوال نہیں۔ لہٰذا میں نے یہ دریافت کیا بلکہ کہا کہ آپ کی بارہا ملاقاتیں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی سے ہوئی ہوں گی؟ فرمانے لگے ہاں ۱۹۲۶ء میں وہ لکھنؤ آئے ہوئے تھے۔ کاکوری کوٹھی میں قیام تھا وہیں میں ان سے ملا تھا اور انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا کر رہے ہو؟ میں اُن دنوں مراثی انیس ایڈٹ کر رہا تھا کہا کام تو بڑا اچھا ہے لیکن مرثیوں کے ان حصوں پر خصوصی طور پر تنقیدی نظر ڈالنے کی ضرورت ہے جہاں مصائب اہل بیت کے بیان کرنے میں اہل بیت کے منصب اور شان کا لحاظ نہیں کیا گیا۔

پروفیسر صاحب نے نواب صدر یار جنگ کی یہ بات جب نقل کی تو میرا ذہن بھی اس طرف منتقل ہوا کہ کہاں یہ حضرات اہل بیت جو سراپا صبر وشکر اور رضائے الٰہی پر گردن جھکانے والے اور کہاں یہ منظر کشی کہ ننگے سر ننگے پیر بے پردہ بیبیاں بال نوچتیں اور سینہ کوبی کرتی چلی آرہی ہیں۔ بیشک ایسی مرثیہ نگاری سے ان مقدس حضرات کے اعلیٰ اور پاکیزہ کردار مجروح ہوتے ہیں ــــ

پروفیسر صاحب نے مجھ سے یہ تو نہیں بتایا کہ نواب صدر یار جنگ سے انہوں نے کیا کہا لیکن مجھے مراثی انیس سے کچھ بند پڑھ کر سنائے اور کہا اس میں ذم کا پہلو کہاں نکلتا ہے بلکہ اس سے اُن حضرات اہل بیت کی شان اور دوبالا ہوتی ہے۔

اس ملاقات کے بعد ایک طویل وقفہ ہوا یہاں تک کہ حضرت مولانا علی میاں صاحب مدظلہ کا سفرنامہ "دریائے کابل سے دریائے یرموک تک" جو اوائل ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا حضرت مولانا نے اس سفرنامہ کو بھی مخصوص حضرات کے پاس بھجوانے کی تاکید کی چنانچہ اس کے طفیل میں پروفیسر صاحب سے دوبارہ ملاقات کا شرف حاصل ہوا، کتاب کا میں نے سرسری تعارف کرایا، کتاب کے اوراق الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے سفرنامہ کا وہ حصہ جو ایران سے متعلق ہے اس کی سرخی کو بہت محظوظ ہو کر پڑھا "ذوق جمال ورعنائی خیال کی سرزمین ایران" پھر اپنے سفر ایران کے واقعات دہرانے لگے اور کہا میں ضرور اسے پڑھوں گا اور دیکھوں گا کہ جس وقت میں نے ایران کا سفر کیا تھا اُس وقت سے اب تک کیا فرق ہوا، بہت سے تاریخی مقامات اور شخصیات کا ذکر کیا۔

پروفیسر صاحب کا بہت ہی خاص اور پسندیدہ موضوع میر انیس کا کلام تھا۔ میں نے "موازنۂ انیس ودبیر" کا ذکر کیا فرمانے لگے علامہ شبلیؒ کا بڑا احسان ہے انہوں نے اس کتاب کو لکھ کر ان لوگوں کے خیال کو بدل دیا جو میر انیس کو صرف ایک خاص مذہبی فرقہ کا شاعر سمجھتے ہیں۔ کچھ دیر تک میر انیس ہی موضوع رہے اُن کے منتخب اور چیدہ اشعار بڑا مزہ لے لیکر سناتے زبانی بر ابر سناتے، فرمانے لگے کہ میر انیس جس وقت خود اپنا کلام پیش کرتے اور اس میں منظر کشی کا موضوع ہوتا تو سامعین کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر آجاتا پھر اس کے بعد پروفیسر صاحب مجھے لے کر ایک بڑے سے ہال میں گئے اور وہاں وہ کتبات دکھائے جو میر انیس کے مزار اور قبر پر لگوائے جانے تھے۔

میر انیس کے علاوہ ان کا دلچسپ موضوع واجد علی شاہ تھا۔ پروفیسر صاحب نے ان تمام پھیلی ہوئی خبروں کی تردید کی جس سے واجد علی شاہ کی شخصیت مجروح اور کردار داغدار ہوتا ہے انہوں نے واجد علی شاہ کو ایک مدبر اور منتظم حکمراں کی حیثیت سے پیش کیا ہے اسی سلسلہ میں ذکی کاکوروی کی کتاب "مطالعہ" کا ذکر کیا جس میں پروفیسر صاحب کے اس مقالہ پر زبردست تنقید تھی بلکہ اس کو بڑی طرح سے کنڈم کیا گیا ہے ــــ جو "مقبول" مرتبہ خیر بہوروی میں شامل ہے۔ فرمانے لگے ایسے شخص کا کیا اعتبار جو دل میں بغض رکھتا ہو اور جاہل ہو۔ میں نے اُن کی ناگواری کی خاطر گفتگو کا رخ دوسری طرف پھیر دیا۔ علمائے شیعہ میں غالباً وہ سب سے زیادہ مولانا علی نقی کے معتقد اور قائل تھے ہر سال اُن سے اپنے یہاں مجلس پڑھواتے تھے۔ انھیں کی زبانی معلوم ہوا کہ مولانا سید علی نقی کی شخصیت حضرات شیعہ کے مابین مختلف فیہ ہے، ایک جماعت ان کی مخالف ہے دوسری موافقت میں ــــ معلوم ہوا کہ لکھنؤ کے شیعہ حضرات کا اختلاف اس بارے میں اتنا بڑھا کہ علمائے ایران کو اس میں دخیل ہونا پڑا معلوم نہیں یہ اختلاف اب تک دور ہو سکا یا نہیں؟

غرضکہ پروفیسر صاحب سے دیر تک مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں جس واقعہ کو سناتے پوری تفصیل کے ساتھ من وعن سناتے کوئی جزء نہ چھوٹنے پاتا لیکن بار بار نسیان اور قوت حافظہ کی شکایت کرتے اور کہتے کہ اب دماغ کام نہیں کرتا ہے۔ اس ملاقات میں بھی پہلی ملاقات کی طرح معذرت کے ساتھ میں نے اجازت مانگی اور اسی خیال کے ساتھ اٹھا کہ ان صاحب کے پاس اطمینان کے ساتھ زیادہ وقت لے کر آنے کی ضرورت ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ ان سے استفادہ کیا جا سکے۔ چلتے وقت میں نے عرض کیا کہ اس سفرنامہ کے سلسلہ میں حضرت مولانا علی میاں صاحب مدظلہ کو آپ کے تاثرات اور خیالات کا انتظار رہے گا، پروفیسر صاحب نے میرا نام اور پتہ دریافت کیا اور کہا لکھ کر دیدو میں نے لکھوا دیا اس کے بعد مجھے برابر انتظار رہا کہ اس کتاب کے سلسلہ میں پروفیسر صاحب کا تبصرہ دیکھنے کو ملے گا لیکن افسوس طویل انتظار کے باوجود تبصرہ دیکھنے کو نہ ملا یہاں تک دسمبر ۱۹۸۰ء میں پروفیسر صاحب کا وقت موعود آگیا اور وہ عالم فانی سے عالم باقی کی طرف انتقال فرما گئے۔

اس بات کا ہمیں شدید قلق اور یہ احساس رہا کہ وہ دونوں کتابیں جو حضرت مولانا مدظلہ کی طرف سے پروفیسر صاحب کو پیش کی تھیں ان پر کچھ تبصرہ یا اظہار خیال ورنکار ان کی وصولیابی کی اطلاع تک حضرت مولانا کو نہ ہوئی حالانکہ میں اس یقین کے ساتھ واپس ہوتا تھا کہ پہلے مرحلہ میں وصولیابی رسید اور دوسرے مرحلہ میں تبصرہ ضرور ہو چکے گا۔

سید محمد حسن موتیہاری ندوی

اسلام اور وطنیت

تاریخ کے مختلف ابواب پر گہری نظر ڈالنے کے بعد یہ حقیقت آشکارا ہوئی کہ وطنیت [illegible] اور قومیت کا جذبہ نیز قومی فخر اور جغرافیائی تعصب کا زیادہ لحاظ درحقیقت مغربی فطرت کا خاصہ ہے جو نسلاً بعد نسل میں برابر منتقل ہوتی رہی ہے لیکن اسلام کو اس نظریہ سے دور کا بھی رشتہ نہیں ہے کیونکہ اسلام نہ کسی ایک وطن کے لئے آیا ہے، نہ کسی خاص ملک کے لئے، نہ کسی خاندان کے لئے اور نہ کسی خاص ذات وجماعت کے لئے، بلکہ اسلام ایک ہمہ گیر و عالمگیر مذہب ہے، یہ ساری دنیا کے لئے آیا ہے۔

بالکل یہی حیثیت مومن اسلام کی بھی ہے کیونکہ ساری کائنات خدا کی ہے اور مومن بھی خدا کا خلیفہ ہے، لہذا ساری کائنات مومن کا اپنا وطن ہے جیسا کہ وعدۂ خداوندی ہے۔ "وعد الذین امنوا منکم وعملوا الصٰلحت لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم" اس آیت کریمہ کے اندر مالک کائنات کی طرف سے تمام روئے زمین پر مومن کی وراثت ہونے کا اعلان صریح ہے، اس آیت کے پیش نظر حکیم مشرق و مغرب اقبالؒ کی صدا یوں بلند ہوئی ؂

مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے
مومن کا مقام ہر کہیں ہے

نیز حدیث کے پیش نظر یوں گہر بار ہیں ؂

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی
رہ بحر میں آزاد وطن صورت ماہی
ہے ترک وطن سنت محبوب الٰہی
دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی
گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشاد نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اقبالؒ کی نگاہ میں مومن کی حیثیت ایک عالمی حقیقت ہے، رنگ و نسل اور ملک و وطن کی جغرافیائی حدود میں اُسے پابند نہیں کیا جا سکتا وہ مکان و زمان کی حدود سے متجاوز ہے چنانچہ اس خیال کو ایک مقام پر یوں نظم کرتے ہیں ؂

[illegible]
اس کے سمندر کی موج، دجلہ و دنیوب و نیل
اس کے زمانے عجیب اس کے فسانے غریب
عہد کہن کو دیا اس نے پیام رحیل
ساقی ارباب ذوق فارس میدان شوق

بادہ ہے اس کا رحیق تیغ ہے اس کی اصیل

مغرب کی بدعت وطنیت پر اقبالؒ کی یہ صدائے ملک دوز کس قدر حملہ آور ہے ؂

درویش خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی، نہ صفاہاں، نہ سمرقند

نیز تاریخ کے صفحات اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ وطنیت مسلمانوں کے مذہبی روایات کے سراسر منافی ہے۔

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جب ہم چودہ سو سالہ اسلامی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو مجاہدین اسلام کی ایک طویل از طویل قطار وطنیت سے بالکل بیگانہ و برطرف، عین اسلامی رنگ میں نظر آتی ہے، مثلاً اسپین کا وہ ساحل جہاں ایک جانباز سپہ سالار طارق ابن زیاد واپسی کی اپنی تمام کشتیوں کو نذر آتش کرکے گویا زبان حال سے گویا نظر آتا ہے۔

"ہمارا دیار و وطن کسی ملک کا کوئی گوشہ یا کوئی ملک نہیں کہ ہم مہجوری وطن، فرقت اہل و عیال اور خوف جاں کے غموں کے شکار ہوں بلکہ دنیا کا ہر ہر چپہ خواہ وہ خشکی میں ہو یا تری میں ہمارا وطن اور ہمارا ملک ہے۔"

؂ خندید و دست خویش بہ شمشیر برد و گفت
ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست

اسی طرح اسلامی تاریخ کے درخشاں ماہتاب، سعد ابن ابی وقاص، خالد ابن ولید، مثنیٰ ابن حارثہ، عقبہ ابن عامر، محمد بن قاسم اور فاتح عظیم از افریقہ تا حد فرانس موسیٰ ابن نصیر وغیرہ کے اسمائے گرامی تاریخ اسلام کے لئے ہمیشہ قابل فخر اور وطنیت و قومیت کے اوپر ہمیشہ ضرب کاری رہیں گے۔

البتہ اس بحث میں یہ اعتراض ضرور پیش آتا ہے کہ جب وطنیت اور قید مقام سے اسلام کو کسی طرح کا کوئی واسطہ نہیں ہے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے وطن مکہ سے محبت کس بنا پر تھی؟ اور آنحضرتؐ نے ہجرت فرماتے وقت جوش الفت سے بیتاب ہوکر یہ کیوں فرمایا تھا؟

واللہ انک لاحب ارض اللہ الیّ واللہ لاحب ارض اللہ الی اللہ ولولا ان اھلک اخرجونی منک ما خرجت۔

یعنی (اے سرزمین مکہ بخدا تو مجھے خدا کی تمام روئے زمین میں سب سے زیادہ محبوب ہے اور خدا کے نزدیک بھی تو تمام روئے زمین سے زیادہ محبوب ہے، اگر تیرے باشندے مجھے تجھ سے نہیں نکالتے تو میں نہیں نکلتا۔)

نیز جب کہ یہ انسان کا ایک اخلاقی جذبہ اور فطری حق ہے کہ وہ اپنی جائے پیدائش سے محبت کرے تو پھر وطنیت کو مذموم فعل کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے۔؟

یہ اعتراض اگرچہ تشویشناک ہے لیکن حقیقت سمجھ لینے کے بعد پھر اس کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی، شاعر مشرق علامہ اقبالؒ نے جاوید نامہ میں اس اعتراض کا نہایت ہی لطیف اور معقول جواب یوں نظم کیا ہے ؂

با وطن اہل وطن را نسبت است
زانکہ از خاکش طلوع ملتے است
اندریں نسبت اگر داری نظر
نکتہ بینی ز مو باریک تر
گرچہ از مشرق بر آید آفتاب
با تجلی ہائے شوخ و بے حجاب
در تب و تاب است از سوز درون
تا ز قید شرق و غرب آید بروں
بر دمد از مشرق خود جلوہ مست
تا ہمہ آفاق را آرد بدست
فطرتش از مشرق و مغرب بری است
گرچہ او از روئے نسبت خاوری است

مذکورہ اعتراض جس قدر اہم ہے اس لحاظ سے جواباً اقبالؒ کے اس اسلوب و انداز سے بہتر اسلوب غیر ممکن ہے۔ اس نظم میں آفتاب کی جو مثال پیش کی گئی ہے وہ اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک ایسی موزوں اور نادر مثال ہے کہ اس سے مطلوبہ بحث کا کوئی خفیف سے خفیف پہلو بھی فوت نہیں ہے، فرماتے ہیں کہ آفتاب اگر مشرق سے طلوع ہوا کرتا ہے اور اس بنا پر مشرق سے اس کو ایک طرح کی نسبت بھی ہے لیکن فیض و اثر اس قدر عام اور وسیع ہے کہ اس کی وجہ سے وہ ہر قسم کی حد بندی اور مقامی خصوصیت یعنی مشرقی خصوصیت سے بالکل مستغنی ہو جاتا ہے ــــ بالکل اسی طرح اگرچہ نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور صحابہ کرامؓ کو اپنے وطن مکہ سے محبت ونسبت تھی لیکن مانند آفتاب انکا فیض و اثر اسقدر عام اور وسیع تھا کہ اس کی وجہ سے وہ ہر قسم کی حدبندی اور مقامی خصوصیت سے بالکل مستغنی ہو جاتے ہیں، اور اسلام کے اندر وطنیت کی تردید ہو جاتی ہے اور اس کے خلاف اسلامی جذبات اقبالؒ کی آواز میں یوں گونج اٹھتے ہیں ؂

برو ایں دام بر مرغ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

وطنیت کی مذمت کے لئے یہ تاریخی شہادت کافی ہے کہ اس نے مسلمانوں کی عالمگیر اخوت اور قومی وحدت کو اتنا سخت صدمہ پہونچایا ہے جس کا دردانگیز منظر آج بھی چشم تصور کے سامنے آکر دل کو مجروح کر دیتا ہے۔

دور نہ جائیے یہیں چند ہی قدم کے فاصلہ پر بنگلا دیش میں جذبۂ وطنیت و قومیت نے جو بدل ادا کئے ہیں، کیا ان کے دردانگیز و المناک مناظر نے ہلاکو و چنگیز کی بربریت اور ظلم و ستم کی تاریخ نہیں دہرادی؟ اگر تاریخ کے صفحات جذبۂ وطنیت و قومیت کے ایسے ہی نتائج سے بھرے پڑے ہیں تو پھر وہ کون سا پہلو ہے جو ہمیں وطنیت و قومیت کی اجازت دیتا ہے۔

وطنیت و قومیت کے انہی نتائج کے پیش نظر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد احادیث میں ان کی سخت مذمت فرمائی اور انہیں صدائے جاہلیت قرار دی ہے، مثلاً ایک انصاری اور مہاجر میں جھڑپ ہو گئی، انصاری پکار اٹھا یا للانصار! یعنی اے انصار دوڑو، اور مہاجر نے آواز دی یا للمہاجرین! جب آپ نے یہ آواز سنی تو فرمایا" مادعوی جاھلیۃ دعوھا انھا منتن" یعنی یہ صدائے جاہلیت کیسی اس خباثت کو چھوڑو۔

اس موضوع پر یہ بات ضرور پیش نظر رہنی چاہئے کہ ہمارے درمیان کی آواز ... Patriotism (حب الوطنی) اگر تشدد و تعصب اور قومیت سے پاک و بری ہو اور اس کے اندر صرف اپنے سماج و سوسائٹی، اور ملک و وطن کی فلاح و بہبودی کے جذبات کارفرما ہوں تو پھر اسلامی نقطۂ نظر سے یہ قابل مذمت نہیں ہے۔ البتہ اس کی مذمت اس وقت ضرور لازم آتی ہے جب اس لفظ سے یورپین قوموں جیسی حب الوطنی مراد لی جائے، کیونکہ ان کی حب الوطنی اپنی اصل حد سے تجاوز کرکے تعصب و قومیت کے خطرناک نتائج کی حد تک پہونچ چکی ہے

آج بھی اُن پر تعصب و قومیت کا غلبہ اس قدر ہے کہ وہ تہذیب و تمدن اور انسانی محبت و مساوات کے دعوے کے باوجود بھی اپنے آپ کو فوقیت و امتیاز کا ٹھیکہ دار قرار دیتی ہیں، ایشیائی قوموں کو اپنے مقابلے میں اس قدر حقیر و ہیچ سمجھتی ہیں کہ ان کے ساتھ بیٹھنا اور سفر کرنا بھی اپنی توہین اور مکروہ سمجھتی ہیں، اس سلسلہ میں گاندھی جی کا وہ واقعہ مشہور ہی ہے جو انہیں South Africa (جنوبی افریقہ) میں پیش آیا تھا، جب انگریزوں نے گاڑی کے ڈبے سے Blackman کہہ کر نہایت ذلت کے ساتھ نکال دیا اور وہ جاڑے کی سرد رات میں رات بھر ٹھٹھرتے رہے۔

ان کا سوانح نگار لکھتا ہے:-

So he just sat and shivered in the dark waiting room, without a friend, alone in this strange, unkind land.

غرض اسلامی اور انسانی نقطۂ نظر سے یورپی حب الوطنی ازحد مجروح و مذموم ہو چکی ہے لہذا اس کی تصدیق و تحسین انسانیت سوزی کی تائید مزید کے سوا، کچھ نہیں۔

●●

نفس کی غلامی

ایٹم بم سے زیادہ ہلاکت خیز اور تباہ کن

مترجم: سید تکریم حسین، ہفتم عربی۔ ندوہ

ذیل میں مولانا سید ابو الحسن علی ندوی صاحب مدظلہ کے اس عربی مضمون کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے جو مکہ مکرمہ سے شائع ہونے والے موقر ماہنامہ "رابطۃ العالم الاسلامی" میں چھپا تھا۔

اس دنیا میں آج جو زندگی ہم بسر کر رہے ہیں اس کا ظہور مختلف شکلوں اور متفرق صورتوں میں ہوا۔ ان میں سے ہر ایک کا ایک خصوصی نام ہے مثلاً مشرقی زندگی، مغربی زندگی، جدید انتہا پسندانہ زندگی اور قدامت پرست پس ماندہ زندگی۔ اسکے علاوہ بھی بہت سے نام اور اصطلاحات رائج ہیں۔

لیکن درحقیقت زندگی کی صرف دو ہی قسمیں ممکن ہیں، کوئی تیسری قسم نہیں۔ ایک قسم کی زندگی وہ ہے جو نفس کی غلامی پر قائم ہو، دوسری وہ جس کی اساس و بنیاد اللہ کی عبادت پر ہو۔ ان دو قسموں کے علاوہ زندگی کی دوسری تمام قسمیں یا تو ان کی تابع ہیں یا فرع۔

تو جس زندگی کی بنیاد نفس کی عبادت و غلامی پر ہوتی ہے، اس کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ انسان نفس کا بندہ اور شیطان کا غلام ہو نیز یہ زندگی ہر قید و بند سے آزاد اور بے لگام ہوتی ہے۔

دوسری زندگی جس کی اساس اللہ کی عبادت اور ایمان پر ہوتی ہے، یہ اس مومن کی زندگی ہوتی ہے جو اپنے خالق پر ایمان و اعتقاد رکھتا ہے اور اپنی مرضی میں اللہ کے ارادہ اور اس کے حکم پر راضی ہوتا ہے۔ وہ پورے طور پر یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ صرف اللہ کی ذات ہی ایسی ہے جو اس کے فائدوں اور ضرورتوں سے باخبر ہے، کائنات میں اس خدا کے علاوہ کوئی ذات ایسی نہیں جو خدا سے زیادہ اس کی منافع و ضروریات سے واقف ہو نیز یہ کہ خدائے وحدہٗ لاشریک کی ایسی ہستی ہے جس نے انسان کے لئے اصول و قوانین نازل فرمائے پھر ان کو واجب العمل اور زندگی میں ان کے نفاذ کو لازمی قرار دیا اس لئے کہ زندگی کا قیام ان کے بغیر ممکن نہیں۔

انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیم صرف اس لئے مبعوث فرمائے گئے کہ وہ لوگوں کو تنہا ایک خدا کی بندگی کی دعوت دیں، اور جب بھی کوئی نبی اپنی دعوت میں کامران ہوئے تبھی اللہ کی عبادت نفس کی غلامی پر غالب آئی مگر یہ کہ نفس کی عبادت کا اثر کسی زمانے میں ختم نہیں ہوا بلکہ مختلف زمانوں میں جب بھی اسے ابھرنے کا موقع ملا وہ ابھری۔ بسا اوقات تو اس کی تاثیر میں اضافہ ہوا اور وہ غالب آئی۔

افسوس کا مقام یہ ہے کہ آج کے اس دور میں نفس کی غلامی کا پورے طور پر تسلط ہو گیا ہے حتیٰ کہ زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس پر نفس کی غلامی کا غلبہ اور تسلط نہ ہو۔ بازاروں میں، دفتروں میں، کارخانوں میں ہر جگہ اسی کی حکومت ہے گویا کہ وہ ایسا بحر زخار ہے جس کی موجیں ہر خورد و کلاں کو نگلے جا رہی ہے۔ کیا آپ جانتے کہ غلامی نفس کا بازار کیوں گرم ہوا اور کس چیز نے اس کو پسندیدہ و مقبول بنایا۔؟ اس کی مقبولیت و پسندیدگی کی وجہ صرف جلد حاصل ہونے والی لذت ہے۔

میں اس لذت و شیرینی کا مخالف نہیں ہوں جس سے انسان اپنی زندگی میں لطف اندوز ہوتا ہے بلکہ جلد حاصل ہو جانے والی لذت کی فکر اور اس میں مست ہو جانے کا میں مخالف ہوں اور یہ ایک غلط فکر ہے، یہی ہے وہ فکر جس نے لوگوں کے لئے طرح طرح کی مشکلات و مصائب کو جنم دیا اور یہی چیز دنیا میں ہلاکت، تباہی و بربادی نیز فتنوں کا سبب بنی اور اگر لوگ اس غلط فکر کے پرستار نہ ہوتے تو صورت حال ویسی نہ ہوتی جس کا آج ہم مشاہدہ کر رہے ہیں۔

اے مسلمانو! تم نے نفس کو لائق عبادت اور قابل پرستش بنا کر اپنے آپ پر ظلم کیا ہے، جبکہ تمہارا فریضہ تو یہ تھا کہ تم صرف اللہ کی عبادت کرتے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتے اور یہ کہ تم تمام لوگوں کو اللہ کی عبادت کی طرف بلاتے۔ یہاں تک کہ تم دنیا میں مثالی مسلمان کی زندگی کا کامل نمونہ بن جاتے لیکن تم نے تو نفس کی غلامی کو اللہ کی عبادت پر ترجیح دی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تم دنیا و آخرت دونوں میں گھاٹے میں رہے، بلکہ لوگوں کے خسران و نقصان کا سبب بنے اور اگر تم اس ڈیوٹی کو انجام دیتے اور اس فریضہ کو کما حقہٗ بجالاتے تو یقیناً نفس کی عبادت رسوا ہو جاتی، شیطان کا کام نابود ہو جاتا اور اللہ ہی کا بول بالا ہو۔

آج کی سب سے بڑی مصیبت و مشکل یہ ہے کہ جو لوگ سیاست و تدبر میں قائد نظر آتے ہیں واقعتاً وہی نفس کے سب سے بڑے پجاری ہیں۔ دنیا اور نام قومیت کے فریب میں مبتلا ہو کر دنیا کو تباہ کر دینے پر تُل گئے ہیں اور ان کے پیروکار برابر ان کے نقش قدم پر بڑھے چلے جا رہے ہیں۔

یقین جانو! کہ نفس کی غلامی ایٹم بم سے زیادہ ہلاکت خیز و تباہ کن ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ ان ایٹمی بموں کا تذکرہ آتے ہی تم غیظ و غضب میں بھر جاتے ہو اور سمجھتے ہو کہ جلد ہی یہ بم دنیا اور اس کے رہنے والوں کو مکمل طور پر تباہ و برباد کر ڈالیں گے لیکن میں کہتا ہوں کہ ان بموں پر تمہیں غصہ نہیں آنا چاہئے ان کا، کوئی قصور نہیں، اصل مجرم تو ان کا موجد ہے بلکہ وہ ادارے اور تنظیمیں ہیں جس نے انسان کو اس ہلاکت خیز بم کی ایجاد پر آمادہ کیا۔ حقیقتاً جرم انہیں کا ہے۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ ان اداروں اور اس تمدن کے ظاہر ہونے کا سبب وحید نفس کی غلامی اور شیطان کی بندگی ہے۔

یہی کشتی ملت کے ناخدا ہونگے

عربی مدارس کے قیام کا سب سے بڑی غرض یہ تھی کہ یہاں دین و ملت کے ایسے سپاہی تیار کئے جائیں جو ہر حال میں اسلام کی حفاظت کر سکیں اور الحاد و بے دینی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک سکیں۔ آغاز کار کے وقت ان درسگاہوں نے اس زمانہ کے حالات کے مطابق مفید و مؤثر لائحہ عمل تیار کیا تھا اور نصاب و نظام تعلیم کے ایسے خاکے بنائے تھے جو اس وقت کی ضرورت کے مطابق تھے۔ جبتک وہ فضا قائم رہی یہ نظام تعلیم مفید اور کارگر ثابت ہوا لیکن اب جب کہ عرصہ سے حالات بدل چکے ہیں ضرورت ہے کہ ہماری درسگاہوں میں بھی انقلاب ہو، زمانہ کی نئی ضرورتوں کے مطابق پھر سے نصاب تعلیم مرتب ہو اور تعلیم و تربیت کے ایسے اسلوب اختیار کئے جائیں جو طلبہ کو وقت کی ضرورتوں کے مطابق زندگی کے نئے میدانوں کے لئے تیار کر سکیں، یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ آج کے طلبہ کل کے علماء ہوں گے، قوم کی باگیں ان کے ہاتھ میں ہوں گی اور یہی کشتی ملت کے ناخدا ہوں گے۔

اسلام دوسرے مذاہب کی طرح صرف چند دعاؤں اور عبادتوں تک محدود نہیں بلکہ زندگی کے تمام گوشوں پر محیط ہے، دین و دنیا کی امتیازی تفریق کی اسلامی تعلیم میں کہیں گنجائش نہیں، ضرورت ہے کہ اسلامی تعلیم گاہوں کا نصاب و لائحہ عمل ترتیب دیتے وقت یہ حقیقت پیش نظر رہے تاکہ ندوہ کوئی بنیادی غلطی نہ ہونے پائے اور ایسے تعلیمی مرکز قائم ہو سکیں جو دین و دنیا کی جامعیت کے نمونے ہوں۔ آج جو فتنے اٹھ رہے ہیں ان کا تدارک اگر ممکن ہے تو صرف اسی وقت جب کہ ہم اس بنیادی سوال کو حل کر لیں اور اس اصول کی روشنی میں اپنے مدارس پر ایک اصلاحی نظر ڈال لیں۔

یہ باتیں عرصہ سے ہو رہی ہیں اب شاید مشکل ہی سے کوئی حلقہ ایسا ہو جو حالات کی نزاکت کو محسوس نہ کرتا ہو اور اس کے تدارک کے لئے بیقرار نہ ہو۔ ضرورت ہے کہ یہ باتیں اب عمل کا قالب اختیار کریں اور خیالی خاکوں میں حقیقت کا رنگ بھرا جائے، دین و ملت کے خدمت گزار کسی جگہ جمع ہوں جزئی اور فروعی اختلافات نظرانداز کرکے مستقبل کی فکر کریں اور آنے والے خطرات کے پیش نظر ایک نئی تنظیم اور ایک نئے اتحاد کی بنیاد ڈالیں، جہاں تک ندوہ کے خادموں کا تعلق ہے وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی اتحاد و تعاون کے لئے ہیں اور اپنی بساط کے مطابق ہر خدمت کے لئے حاضر ہیں۔

(مولانا معین اللہ ندوی نائب ناظم ندوہ)

حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی عازم سفر حجاز و لندن

ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ حجاز تشریف لے گئے ہیں، موصوف کا وہاں ۲۰ اپریل تک قیام رہے گا۔ ۲۰ اپریل کو وہ لندن تشریف لے جائیں گے جہاں عالمی کانفرنس میں افتتاحی خطاب فرمائیں گے ــــــ حضرت مولانا مدظلہ کی واپسی ان شاء اللہ ماہ مئی میں ہوگی۔

حضرت مولانا مدظلہ کے شریک سفر مولانا محمد رابع ندوی ہیں۔

پرنٹر پبلشر مسئول سید محمد الحسنی ندوی نے تنویر پرنٹنگ پریس دہلی سے طبع کرا کر دفتر تعمیر حیات ندوہ لکھنؤ سے شائع کیا۔
اڈیٹر: اسحاق جلیس ندوی
کتابت: جلال الدین جیسوی ندوی